مکتبہ مدنیہ
۱۴- اردو بازار لاہور
www.noorehidayat.org

عقیدت اور عقیدہ

تالیف

حضرت مولانا سید مفتی مختار الدین صاحب ظلہ کربوغہ شریف
خلیفہ مجاز برکۃ العصر شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی
نور اللہ مرقدہ

مکتبہ مدنیہ
۱۴- اردو بازار ○ لاہور
فون : ۲۲۸۹۷۷ - ۶۲۵۲۰

فہرست مضامین

فہرست مضامین

باب اوّل

شرک کی حقیقت اور انواع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم الانبیاء
وعلیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد:-

توحید و شرک اور محبت و تعظیم کے موضوع پر اردو زبان میں پہلے سے
کتابیں موجود ہیں، جن میں بعض حضرات کی زبان اور قلم جب توحید کے بارے
میں چلنا شروع ہوتے ہیں تو قرنِ اول سے لے کر آج تک بڑے سے بڑا
عالم، محدث، فقیہ یا صوفی بھی انہیں شرک سے خالی نظر نہیں آتا اور عہدِ رسالت
سے آج تک کا تقریباً ہر مسلمان مشرک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح جب
محبت کو تحریر و تقریر میں لایا جاتا ہے تو فروعی مسائل جیسے توسل وغیرہ کے انکار
کرنے والوں کو بے ادب اور گستاخ باور کرایا جاتا ہے۔ اگر ہمارے اہلِ قلم خصوصاً
علماء کرام جن پر امت کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری ہے اور اہلِ اسلام
میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا اور مومنین میں بھائی چارہ کو فروغ دینا ان کا فرضِ
منصبی ہے، پیار و محبت سے اور نرم الفاظ استعمال کر کے وَجَادِلْهُم بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ کو مدِنظر رکھ کر ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے اور سمجھانے
کی کوشش کرتے اور خالص علمی مسائل عوام اور کم استعداد لوگوں کے سامنے لانے
اور ان کو ان باریک مسائل میں الجھانے سے گریز کرتے جیسا کہ ہمارے اسلاف کا
شیوہ تھا تو بڑی حد تک اصلاح بین الناس میں کامیاب ہوتے۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ حضرات علماء کرام کسی کو کافر بناتے نہیں بتاتے ہیں، تاہم اگر نرم الفاظ
اور شیریں سخنی سے دوسرے کو اپنا نظریہ پیش کیا جاتے اور ٹھنڈے دل اور فراخ دلی
سے اس کی بات پر کان دھرے جاتیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی

کا نظارہ پیش نہ کریں، جن جذبات کو غلط طریقہ سے ابھار کر شیطان ہم میں نفرت و کدورت پیدا کرتا ہے انہی جذبات کو اگر صحیح نصب العین کے حاصل کرنے میں صرف کرایا جائے تو وہی سادہ لوح مسلمان رحماء بینہم کا منظر پیش کر سکتے ہیں۔

فروعی مسائل میں ائمہ اہل سنت کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے مگر ان کا آپس میں نہایت بلند درجہ ادب و تعظیم سے پیش آنا بھی اظہر من الشمس ہے حضرت امام شافعیؒ کا حضرت امام اعظمؒ کی شان میں اَلْفُقَہَاءُ عِیَالُ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ جیسے الفاظ سے رطب اللسان ہونا کسی فقہ کے کسی ابتدائی طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ غرضیکہ باوجود فروعی مسائل میں اختلاف کے ہمارے اسلاف کرام کا ایک دوسرے کا عزت و اکرام کرنا اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

اس لئے ایک عرصہ سے یہ آرزو تھی کہ توحید اور محبت کے مضامین کو یکجا کر کے قدرے تفصیل اور وضاحت سے افراط و تفریط سے پاک نقطۂ نظر پیش کیا جائے اور اختلافی مسائل جیسے دست بوسی، قیام اور توسل کے متعلق ایسے انداز سے لکھا جائے کہ قائلین اور منکرین کے موٹے موٹے دلائل مختصر طور پر قارئین کے سامنے آجائیں تاکہ اوسط طریق اور مسلک کی نوعیت خود بخود واضح ہو جائے اور فروعی مسائل میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ اختلاف برائے اختلاف کو چھوڑ کر کُلُّ مُؤْمِنِیْنَ اِخْوَۃٌ کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے اور خواہ مخواہ کسی مسلمان کی توہین و تکفیر نہ ہو اور نہ ہی کسی مسلمان کو مبتدعین و مشرکین کی صف میں کھڑا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور مسلمانوں کے لئے اسے مفید فرمائے اور وَمَا اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ کا مصداق بنائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہِمْ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ (آمین)

بندہ مختار الدین

باب اوّل

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم

اللہ تعالیٰ و تبارک کی ہستی ایک ایسی ظاہر و بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شک یا انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کسی کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہو گئی ہو تو اس کے لئے اللہ رب العزت کی ذاتِ عالی کا یقین فطری طور پر بالکل ایسا ہی واضح اور عیاں ہے جیسے کہ خود اپنی ہستی کا وجود۔ یہاں تک کہ اگر بظاہر انکار کرنے والوں کے اندرون کو بھی ٹٹولا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دِلوں میں خدا کی ہستی کا اقرار پوشیدہ طور پر موجود ہے۔ لیکن اللہ جل شانہٗ کی وحدانیت کا مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں بے شمار قومیں گمراہ ہوئی ہیں۔ اسی لئے دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ہیں، ان سب کی دعوت کا آغاز عقیدہ توحید ہی سے ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک نے شرک کے مٹانے پر اپنی پوری قوت صرف کر دی۔

شرک کی ابتداء

شرک کی ابتداء کے بارے میں عبد الشکور سالمیؒ اپنی کتاب "التمہید" میں جو کچھ فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرک کی ابتداء اور ظہور حضرت اخنوخ علیہ السلام جن کو حضرت ادریس علیہ السلام کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے، کے وقت سے ہوئی۔ اس سے پہلے مخلوق نے کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا، البتہ بعض افراد انفرادی طور پر معصیت اور نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے تھے، جیسے آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کیا تھا۔

حضرت ادریس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو علوم و ہدایت کے ساتھ بطورِ معجزہ نجوم اور رمل کا علم بھی دیا گیا تھا۔ ان کے بعد ان کے چند شاگرد اور خاص تلامذہ جن میں ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر شامل تھے، ان کی قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ جب حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تو یہ پانچوں حضرات شب و روز عبادت اور لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔ جب یہ ہستیاں بھی اس عالم سے تشریف لے گئیں تو قوم پریشان ہوئی کہ اب کس سے احکام دین سیکھیں اور رہنمائی حاصل کریں۔ پھر ان میں سے بعض[1] نے مشورہ کیا کہ ان بزرگوں کے مجسمے بنا لئے جائیں تاکہ ان کو دیکھ کر ان حضرات کی یاد تازہ رہے اور ان کی تعلیمات و ہدایات اور طور طریقے بھولنے نہ پائیں۔ قوم نے ایسا ہی کیا۔ اور مجسمے تیار کر کے ان کے نام بھی وہی تجویز کئے جو ان حضرات کے تھے۔

ابتداء میں یہ لوگ عبادت تو خدا ہی کی کرتے تھے اور ان مجسموں کو صرف یاد تازہ کرنے کے لئے دیکھ لیتے تھے، لیکن ان کی اولاد کے لئے شیطان نے شرک و بت پرستی کے لئے میدان ہموار کر دیا کیونکہ انہوں نے اپنے آباء و اجداد کے عمل کو دیکھا تھا اور جب آباء و اجداد کی نسل گزر چکی تو شیطان ان کی اولاد کے پاس آیا اور ان مجسموں میں داخل ہو گیا، اور انہی بتوں کے ذریعے اس نے یہ اعلان کیا کہ اے لوگو! میں تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہوں، اور تمہارے آباء و اجداد میری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ چونکہ اولاد کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ ان کے آباء و اجداد تو ان بتوں کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ صرف تعظیم و تکریم کرتے تھے، اس لئے شیطان ان کو گمراہ کرنے میں بآسانی کامیاب ہو گیا۔ غافل و نادان قوم نے ان بتوں کی تعظیم و تکریم کے ساتھ جب ابلیس کی ندا کو سُنا تو یہ بات پوری طرح قلب و دماغ میں راسخ ہو گئی کہ دراصل یہی مورتیاں ان کے معبود ہیں اور ان مجسموں کو پیتل، چاندی اور سونے سے تیار کرنے لگے اور شرک و بت پرستی میں

---

[1] عن ابن عباس صارت الاوثان التی کانت فی قوم نوح فی العرب بعد، اسماء رجال صالحین من قوم نوح فلما ھلکوا اوحی الشیطان الی قومھم ان انصبوا الی مجالسھم التی کانوا یجلسون انصابا وسموھا باسمائھم ففعلوا فلم تعبد حتی اذا ھلک اولئک وتنسخ العلم عبدت۔

(رواہ البخاری کتاب التفسیر سورۂ نوح)

مبتلا ہو گئے۔[1]

اور بدستور ان بتوں کی عبادت کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا کہ وہ ان مشرکوں کو خالق حقیقی کی عبادت اور توحید اصلی کی طرف دعوت دیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو دین حق کی طرف بلایا لیکن انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ:-

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ (سورۃ نوح)

(ترجمہ) ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو ودّ اور سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو۔

اور باوجودیکہ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک سمجھاتے رہے، وہ لوگ ان کی اطاعت سے انکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سخت افسوس و یاس کے عالم میں فرمانے لگے۔

---

[1] امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن عساکرؒ نے حضرت شیث علیہ السلام کے حالات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی چالیس اولادیں تھیں بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں۔ لڑکوں میں سے ہابیل، قابیل، صالح، عبدالرحمٰن اور ودّ زندہ رہے۔ سواع، یغوث، یعوق اور نسر انہی کے بیٹے تھے۔ تفسیر ابن کثیر ج۴ ص۴۲۶

علامہ سید محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ پانچوں آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ان سب میں بڑا اور سب سے نیک "ودّ" تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں سب سے پہلے ودّ کو شریک کیا گیا (روح المعانی جز ۲۹)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو اہل عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہوں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں۔ نسر کے متعلق تو یہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے

(تاریخ ارض القرآن کامل صفحہ ۳۱۹)

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔

"میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔"

(کیونکہ ان پر یہ بات صاف طور پر کھل چکی تھی کہ نہ صرف وہ لوگ سڑے ہوئے اعضاء کی طرح بالکل تباہ ہو چکے تھے بلکہ ایمان والوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور ان کی آئندہ نسل بھی بدکار اور کافر ہوگی، مسلمانوں کی اولاد کو گمراہ کریں گے)

پس اللہ تعالیٰ نے ان بدقسمت مشرکین کو غرق کر دیا اور کشتی نوحؑ میں زندہ سلامت بچنے والوں میں نوح علیہ السلام کی اولاد سام، حام اور یافث مع اپنے اہل و عیال کے باقی رہے جن سے آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ جاری رہا، اور اس کے علاوہ وہ پانچ بت یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر بھی مٹی میں دب گئے تھے بعد میں شیطان نے انہیں دوبارہ قبیلہ غطفان کے لوگوں کے لئے آشکارا کر دیا۔ انہوں نے بتوں کی تعداد میں اتنا اضافہ کیا کہ وہ تین سو ساٹھ تک پہنچ گئے اور اسی طرح مشرکین بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ بعض کہتے تھے کہ فرشتے (العیاذ باللہ) اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بعض کا دعویٰ تھا کہ ان کے بت خدا کی بیٹیاں ہیں اور بعض انہیں خدا تعالیٰ کی خدائی میں شریک سمجھتے تھے۔ ان فرقوں میں سے ایک فرقہ ایسا تھا جو نہ تو فرشتوں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں مانتے تھے اور نہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ یہ بت ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت اور سفارش کرتے ہیں، اس لئے جب یہ بت ہم سے خوش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ہم سے راضی ہوگا۔ اور یہ لوگ اس لئے ان بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے (التمہید لابی الشکور السالمیؒ ص ۲۰۶ تا ۲۰۸)

غرض جب لوگوں نے تعظیم و عقیدت میں اعتدال کو چھوڑ کر غلو اور حد سے تجاوز کیا تو یہیں سے شرک و گمراہی کا آغاز ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلی امتوں میں ایسا ہی ہوا کہ جن ہستیوں کے ساتھ ان کی عقیدت تھی ان کے بت اور مورتیاں انہوں نے اس خیال سے بنائی تھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں ان کے وسیلے سے اللہ بھی

و تعالیٰ کے ہاں رسائی ہوگی مگر بڑھتے بڑھتے انہوں نے خود انہی ہستیوں کو معبود بنالیا، انہی کو مدد کے لئے پکارنے لگے، اور انہی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحب تصرف اور خدائی اختیارات کے مالک ہیں، ہماری فریاد رسی و مشکل کشائی یہی کریں گے۔ اس گمراہی سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اپنے بندوں کے ذریعہ بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

شرک کیا ہے

شرک حصہ داری یا شراکت کو کہتے ہیں، اور اسلام میں شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات یا اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو خاص حقوق ہیں، ان میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اللہ کی ذات میں شرک یہ ہے کہ تخلیق کائنات اور اس کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مانا جائے یا کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کر کے اسے اللہ تعالیٰ کا جزء قرار دیا جائے۔ مثلاً مجوس دو خدا مانتے ہیں، ایک یزدان اور دوسرا اہرمن یا جیسے نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک یہ ہے کہ اس کی مخصوص صفات جیسے خالق ہونا رازق ہونا، فاعل مختار ہونا، علیم، خبیر ہونا اور عالم الغیب ہونا وغیرہ۔ غرض اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم

یاد رہے کہ دوسری صفات کمالیہ کی طرح علم بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے جس میں کوئی اس کا سہیم و شریک نہیں۔ جس طرح تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفات کمالیہ سے عاری اور کورے تھے، اسی طرح تمام مخلوق انس و جن اور فرشتے بھی اصل میں بالکل بے علم تھے۔ ان کو جو کچھ بھی علم حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام کائنات میں ایک انسان صرف ایسا ہے جسے پیدائشی طور پر قوت ارادی کے ساتھ علم کی استعداد و قوت بھی دوسری مخلوقات سے زیادہ اور پورے کمال کے ساتھ دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ ظاہری حواس خمسہ (آنکھ، کان، ناک

زبان اور چھونا) سے قابل احساس چیزوں کا ادراک کر کے عقل و فکر اور وجدان کے ذریعے مخفی امور معلوم کرتا ہے۔ وہ آنکھ سے صورتوں کا علم، کان سے آوازوں کا علم، زبان سے ذائقوں، ناک سے خوشبو یا بدبو اور ہاتھ پیر تمام بدن کے چھونے سے کسی چیز کی سختی نرمی گرمی اور ٹھنڈک کا ادراک کر کے اپنے دماغ میں جمع کر لیتا ہے۔ اور عقل و فکر جو دماغ میں رچی ہوئی ہے وہ قلب یعنی دل جوان کا حکمران اور تمام علوم کا سرچشمہ ہے، جنبش اور اشارہ سے دماغ میں امور معقولہ کو خاص شعور کے ساتھ اخذ کر کے جمع کر لیتا ہے۔ پھر وہ نہ صرف ان محسوسات کی صورت و معنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان بجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرف کر کے ان کا تفصیلی تجزیہ کرتا ہے۔ اور اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے اپنے اوپر کھول لیتا ہے۔ کبھی وہ ان جزوی صورتوں کے استقراء و تتبع سے کوئی کلیہ بنا لیتا ہے۔ اور اس سے نئے جزئیات پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی وہ کسی جامع علت کی بناء پر ایک چیز پر دوسری چیز کو قیاس کر کے ایک حکم دوسرے جزئیات اور چیزوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح اور کتنی جزئیات اور چیزیں پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔ اسی طرح وہ کبھی ایک جزئی سے علمی نکات و لطائف پیدا کر کے ایک گہرے علم کو حاصل کرتا ہے۔

غرض انسان اپنے بیرونی و اندرونی حواس اور عقل کے ذریعے وہ علوم حاصل کرتا ہے، جسے دیکھ کر حضرات ملائکہ بھی اس کی علمی استعداد اور تبحر علمی کے معترف ہو جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح انسان میں اللہ تعالیٰ کی ان دی ہوئی قوتوں اور استعداد سے انکار نہیں، اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کہ علم اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت ہے جس کا پرتو عارضی طور پر انسان پر پڑتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس مرحلے پر ہر انسان

لے یہاں علم اور علم کی استعداد و قوت میں فرق کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو علمی استعداد و قوت تو دیتا ہے لیکن انسان علم سے پیدائشی طور پر کورا ہوتا ہے۔

کے لئے جو دروازے جس قدر کھولنا چاہے، وہ اس پر اس قدر کھول دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک مقرر مقدار سے نازل کرتے ہیں۔

عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے

اس لئے مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ عالم الغیب (غیب کا علم جاننے والا) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض وقت انسان کسی چھپی ہوئی چیز کو دریافت کر لیتا ہے لیکن یہ علم غیب نہیں بلکہ ایک مغالطہ ہے جو عام لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام لفظ "غیب" سے مراد لغوی معنی لیتے ہیں یعنی ہر وہ چیز جو ان کے علم و نظر سے غائب ہو، خواہ دوسروں کے نزدیک اس کے علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں، وہ اس کو غیب کہنے لگتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں۔ اس لئے ضروری یہ ہے کہ اس "غیب" کو سمجھ لیا جائے جسے قرآن مجید کی اصطلاح میں "غیب" کہا جاتا ہے۔

غیب کے اقسام

غیب کے معنی مخفی اور پوشیدہ کے ہیں۔ اور کسی چیز کے مستور ہونے کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

اس کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ چیز اس مادی دنیا میں موجود ہو، چاہے زمین پر ہو یا اس کے اندر ہو، یا چاند یا دوسرے سیاروں وغیرہ میں۔ تو یہ چیزیں ایسی ہیں جن میں بہت سی چیزیں فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں۔ اور بعض کے علم میں نہیں ہیں۔ ایک چیز ہمارے سامنے ہے لیکن دوسرا شخص جو اس سے کچھ فاصلہ پر ہے اس سے غائب۔ ایک چیز کسی جگہ موجود ہے۔ ایک ہی جگہ پر دو شخصوں میں سے ایک اس کو اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتا ہے اور دوسرا شخص نظر کی کمزوری کی بنا پر اسے نہیں دیکھ پاتا، یا چند اشخاص ایک ہی جگہ ہیں۔ ان میں سے ایک شخص

اعلیٰ قسم کے دوربین کے ذریعے سینکڑوں میل دور کسی چیز کو دیکھ رہا ہے اور اس چیز کے بارے میں دوسروں کو خبر دے رہا ہے اور دوسرے اشخاص اس چیز کے عینی مشاہدہ سے محروم ہیں۔

اسی طرح ایک شخص خورد بین کے ذریعے ایک قطرہ پانی میں لاکھوں جراثیم اور وائرس کی نقل وحرکت اور ان میں مختلف قسم کے جراثیم کی پہچان اور امتیاز کرتا ہے اور دوسرے عام لوگ اس کی اس خبر کو افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

یہی حال زمین کے اندر مخفی اشیاء اور خزانوں کا ہے، چاند اور دوسرے سیاروں میں موجود چیزوں کا ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ کی ودیعت کی ہوئی تیز حس (خواہ ظاہری حس ہو یا باطنی) کے واسطے سے یا کسی آلے اور تجربہ یا کسی ذریعے سے کچھ چیزیں معلوم یا محسوس کرتا ہے۔ اور کوئی اس سے کورا اور بے خبر ہوتا ہے۔ اس قسم کی ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو غیب نہیں کہا جاتا۔ یہ چیزیں ساری کی ساری موجود ہیں۔ جسے کوئی محسوس اور معلوم کرتا ہے کوئی نہیں، یعنی بعض کے ادراک میں آتی ہیں اور بعض کے نہیں۔

دوسری قسم پوشیدہ چیزوں کی یہ ہے کہ جن کا ظہور تام اب تک نہ ہوا ہو۔ البتہ اس چیز کا مادہ اور اس کے بعض اسباب کا ظہور ہوا ہو یا اس چیز کے دنیا میں آنے کے قرائن موجود ہوں جن کو عام لوگ نہیں جان سکتے۔ البتہ اہل فن اس کو معلوم کر لیتے ہیں جیسے ماہر فلکیات سورج کی رفتار کا اندازہ لگا کر پہلے سے بتا دیتے ہیں کہ مثلاً فلاں دن پانچ بجے سورج طلوع ہوگا اور چھ بجے غروب۔ اور فلاں دن پانچ بجکر دس منٹ پر طلوع آفتاب ہوگا اور پانچ بجکر پینتالیس منٹ پر غروب ہوگا۔ یا کوئی حساب لگا کر کہتا ہے کہ فلاں ماہ فلاں تاریخ کو سورج گرہن یا چاند گرہن ہو گا جیسا کہ جنتریوں اور اوقات کے نقشوں میں یہ معلومات ہمیں ملتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک محسوس اور معلوم چیز کی رفتار سے اندازہ لگانا ہوتا ہے جیسا کہ ایئر پورٹ والے ہمیں جہازوں کی آمد اور اسٹیشن والے ریلوں وغیرہ کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں۔ ان جیسی تمام اشیاء۔ کا تعلق حساب سے ہوا کرتا ہے۔ اسی

طرح ماہرین موسمیات بارش وغیرہ کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہیں۔ ماہرین طب و نفسیات نبض دیکھ کر یا کسی آلے کے ذریعے معائنہ کر کے مریض کی چھپی ہوئی حالت بلکہ اس پر آئندہ آنے والی کسی بیماری کی خبر دیتے ہیں، اور بسا اوقات یہ خبریں پیشین گوئی کے مطابق واقع بھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین موسمیات یا ڈاکٹر وغیرہ کو ایسی خبریں دینے کا موقع اس وقت ہاتھ آتا ہے جب کہ ان واقعات اور حالات کا مادہ اور ان کے بعض اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ماہرین موسمیات مون سون کا رُخ اور اس کی قوت اور رفتار کو دیکھتے ہیں، تو وہ ان سے اندازہ کر کے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ باد و باراں یا گرج چمک کا امکان ہے اور فلاں فلاں جگہ موسم خشک رہے گا۔ اور یہی حال ڈاکٹروں اور طبیبوں کا ہے۔ وہ کسی شخص میں کسی بیماری کے جراثیم دیکھ لیتے ہیں۔ یا کسی بیماری سے دوسری بیماری لگ جانے کا تجربہ ان کو ہوتا ہے یا اسی طرح دوسرے ذرائع سے کسی آنے والے مرض کا مادہ معلوم کر کے خبر دیتے ہیں۔ غرض محکمہ موسمیات والے ہوں یا ڈاکٹر ہوں جتنے بھی ماہرین فن ہیں وہ کسی چیز کے بارے میں اطلاع تب دے سکتے ہیں جب کہ ان واقعات کا مادہ اور اسباب ظاہر ہوں، اگرچہ اس چیز کا وجود منظر عام پر نہ آسکا ہو۔ اور عوام اس سے بے خبر رہتے ہوں۔ اور جب وہ مادہ قوی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا ہے۔ تو ایسی چیزیں جن کے وجود میں آنے کا مادہ موجود ہو چکا ہو، یا کسی چیز کے اسباب و آثار اور نشانات اہل فن کے نزدیک ظاہر ہو چکے ہوں تو وہ چیزیں پردۂ غیب میں نہ رہیں۔ بلکہ ایک گونہ ظہور ان کا ہو چکا ہوتا ہے لیکن ان کی لطافت یا کمزوری کی وجہ سے عام مشاہدہ میں ابھی نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ اور اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ علم جو یقین کا نام ہے۔ وہ ان میں کسی چیز کو حاصل نہیں۔ البتہ جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں، ان کا علم اگرچہ علم ہے مگر وہ "غیب" نہیں۔ کیونکہ اس فن سے کسی موجود اور محسوس چیز کا رُخ رفتار اور اس کی قوت سے حساب لگا

کہ اس کی آمد اور منظر عام پر آنے کا وقت متعین کیا جاتا ہے جیسا کہ چاند گرہن وغیرہ کے اوقات متعین کئے جاتے ہیں۔

مستور چیزوں کی تیسری قسم وہ ہے جن کا تعلق اس مادی عالم سے نہیں بلکہ ان چیزوں کا محل و مقام عالم مثال[1] ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک ظاہری حواس اور آلات سے نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ چیزیں بھی اس لئے "غیب" میں داخل نہیں کہ جو چیزیں پردہ غیب سے عالم مثال میں آجاتی ہیں ایسی چیزیں اگرچہ ہماری نظروں سے غائب ہوتی ہیں لیکن وہ چیزیں عالم ملکوت میں ملائکہ کے سامنے ہوتی ہیں اور ہم بھی بعض اوقات کسی آنے والے واقعہ کو نورانی خواب کے ذریعہ عالم مثال میں دیکھ لیتے ہیں اور بعد میں وہ واقعہ جوں کا توں یا صحیح تعبیر کے موافق ظہور میں آجاتا ہے اسی طرح اہل کشف بیداری کی حالت میں روحانی تجلی میں بعض اشیاء کا ادراک کرتے ہیں اور یہ کسی ولی اللہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اشراقی[2] اور اہل ریاضت بھی کبھی بعض

---

[1] عالم مثال ایک عالم ہے جو عالم ارواح اور عالم اجسام کے درمیان بتایا جاتا ہے بعض علماء اس عالم کو مانتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو تیسری قسم سے وہ مستور چیزیں مراد ہوں گی جن کا خروج پردۂ غیب سے ہو چکا ہو لیکن اس عالم اجسام میں موجود نہ ہوں۔

[2] اشراقیت اور روحانیت عقل پرستی کے خلاف ایک طبعی ردعمل ہے جس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ حق اور یقین کے دریافت کے لئے حواس عقل، علم قیاس وغیرہ قطعاً مفید نہیں ہیں بلکہ مضر ہیں، صداقت اور حقیقت کے یقینی حصول کے لئے مشاہدہ شرط ہے اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفائی نفس اور ایک ایسے اندرونی حاسہ کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے جو روحانیت اور ماوراء طبیعات کا اس طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری حواس ظاہری چیزوں کا ادراک کرتا ہے یہ حاسہ اس وقت بیدار ہو سکتا ہے جس وقت مادیت کو فنا اور ظاہری حواس کو مردہ کر دیا جائے حقائق کی تحصیل اس حکمت اشراق اور نور باطن سے ممکن ہے جو ریاضتوں نفس کشی اور مراقبہ و تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے پاس ایسی باطنی اور اندرونی حاسہ ہے جس کو اگر وہ بیدار کر لے اور ترقی دے تو اس اقلیم کے بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے جن کا ادراک کسی حاسہ

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن خواب، مکاشفہ وغیرہ میں قوت وہمیہ کی آمیزش اس علم و یقین کو ظن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس لئے سوائے انبیاء علیہم السلام کے کشف کے جس قدر طریقے ہیں ان میں غلطی کا احتمال علی مراتب باقی رہتا ہے۔ کسی میں اگر غلطی کا احتمال زیادہ ہے تو کسی کے کشف میں غلطی کا احتمال کم ہے لیکن وہ غلطی کے احتمال سے پاک نہیں۔ اس لئے اس جاننے کو علم بمعنی یقین نہیں کہہ سکتے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کو جو کشف ہوا کرتا ہے اس کے آگے پیچھے ملائکہ کا پہرہ ہوا کرتا ہے جس کی وجہ سے شیاطین قوت وہمیہ و خیالیہ اور عادات طبائع وغیرہ اس پر کچھ دست اندازی نہیں کر سکتے اور وہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہو کر انبیاء علیہم السلام کو دکھائی دیتے ہیں۔ اسلئے ان کے مکاشفات اور خوابیں بھی وحی کی اقسام میں سے ہوتے ہیں، جب کہ اولیاء کرام کے مکاشفات اور الہامات میں محافظت نہیں ہوتی، اس لئے ان کو قرآن و سنت پر پرکھا جاتا ہے۔ ان کے مکاشفات و الہامات ظنی اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے لوگوں پر حجت قاطعہ نہیں ہوتے اور نہ ان پر دوسرے مسلمانوں کو پابند کیا جاتا ہے۔

غیب کی چوتھی قسم آئندہ آنے والے ایسے واقعات ہیں جن کو نہ اللہ تعالیٰ نے اب تک اس دنیا میں پیدا کیا ہے اور نہ ان اشیاء کے آثار و نشانات کو اس مادی عالم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ظاہری سے ممکن نہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایسے اور دوسرے حواس بھی ہیں۔ لیکن بہر حال یہ بھی حواس ہی ہیں جو اسی طرح کمزور اور محدود ہیں جس طرح دوسرے حواس ظاہرہ۔ اور اسی طرح خطا پذیر اور متاثر ہونے والے جس طرح انسان کی دوسری طاقتیں ورنہ اس کے نتائج میں تعارض اور تناقض نہ ہوتا۔ اس میں شک و احتمال نہ پیدا ہوتا۔ اور بڑے بڑے اہم مسائل میں خطا اور غلط روی ممکن نہ ہوتی۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حاسہ کے محسوسات اور اس علم کی تحقیقات میں اس سے کہیں زیادہ تعارض و اختلاف ہے جتنا کہ حواس ظاہری کے محسوسات میں واقع ہوتا ہے اور اہل کشف و اشراق کے علوم و تحقیقات میں اتنا تناقض اور تعارض ہے جس کی نظیر شاید عقلیت میں مل سکے۔

میں بھیجا ہے اور نہ ان کا ورود عالم مثال میں ہوا ہے۔ یہ ایسے تکوینی واقعات اور ایسے غیبی تکوینیات[1] ہیں جن پر غیب کے معنی صادق آتے ہیں اور تکوینیات میں سے یہ ایسے غیبی امور ہیں جن کا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو علم نہیں البتہ ایسے آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا جزوی علم ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندے نبی مرسل کو بذریعہ وحی بتا دیتے ہیں جیسا کہ قیامت کا آنا، حساب و کتاب کا ہونا، دوزخ جنت کے حالات اور دنیا میں آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں[2] لیکن ایسی صورت میں جب کہ اللہ تعالیٰ ان آنے والی چیزوں کی اطلاع اپنے کسی خاص بندے کو کر دیتے ہیں تو وہ چیزیں غیب نہیں رہتیں بلکہ وہ غیب کی خبریں ہو جاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پہنچا دیتے ہیں۔

یہاں تک تو مستور چیزیں بیان ہوئیں جن کا تعلق تکوینیات سے تھا جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ ان امور میں سے صرف جزئیات اور بعض واقعات و حالات کا علم اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی ذریعے سے ضرورت کے مطابق بتا دیتے ہیں۔ لیکن ان امورِ غیبیہ کی کلیات اور ان کے تمام علم تک کسی مخلوق کی رسائی ناممکن ہے خواہ ملک ہو یا نبی مرسل۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (انعام آیت ۵۹) یعنی اس کے پاس غیب کی چابیاں ہیں یعنی وہی غیب کے ذخیروں کا مالک ہے، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا جو کچھ خشکی

---

[1] تکوینی امور وہ تمام حالات اور واقعات ہیں جن کا تعلق قیامت سے یا کائنات میں آنے والے واقعات سے ہے مثلاً یہ کہ کون کب پیدا ہوگا، کہاں پیدا ہوگا، کیا کیا کام کرے گا، کتنی عمر ہوگی، عمر میں کیسے حالات سے گزرے گا وغیرہ۔

[2] جیسے امام مہدی کا آنا، دجال کا آنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ دنیا میں تشریف لانا، دجال کی ہلاکت ان کے ہاتھوں سے ہونا، سورج کا مغرب سے نکلنا وغیرہ۔

ہیں اور جو سمندروں میں ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درختوں سے کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ (اللہ تعالیٰ) اسے جانتا ہے۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ نہیں اور کوئی خشک و تر چیز نہیں مگر یہ کہ سب کچھ ایک کھلی اور واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ قُل لَّآ اَقُولُ لَکُمۡ عِندِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَلَآ اَقُولُ لَکُمۡ اِنِّیۡ مَلَکٌ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوۡنَ (الانعام آیت ۵۰) یعنی اے پیغمبر آپ ان لوگوں سے) کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا علم رکھتا ہوں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو فقط اسی بات پر چلتا ہوں جو مجھ پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) وحی کی جاتی ہے (اور اس کی طرف تمہیں بھی بلاتا ہوں) پھر ان سے پوچھو کیا اندھا (جس کو حقیقت کا کوئی علم و یقین نہیں) اور آنکھوں والا (جو حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے۔

غیب کی پانچویں قسم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا اور اس کی پسند ناپسند کا علم حاصل ہوتا ہے۔ احکامات کا علم جس میں عقائد، اعمال، معاملات، معاشرت اور اخلاق غرض پوری زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات سے واقفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ وہ علم ہے جسے کوئی مخلوق انسان وغیرہ خواہ کتنا ہی ذہین و فہیم ہو اس کی ریاضت اور روحانیت کا پایہ کتنا بلند ہو، اس کا باطن کتنا روشن ہو اسے نہیں جان سکتا نہ اپنے حواس سے نہ قوت شعور سے نہ فراست سے نہ قیاس سے نہ عقل سے نہ نور باطن سے نہ آلات سے البتہ خداوند عالم جو عالم الغیب ہے وہ خود اسے اپنے برگزیدہ بندوں انبیاء و رسل کو عطا فرماتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آتا ہے۔ قُلۡ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ اَمۡ یَجۡعَلُ لَہٗ رَبِّیۡۤ اَمَدًا ؕ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ فَاِنَّہٗ یَسۡلُکُ

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا (الجن ۲۵، ۲۶، ۲۷) یعنی (اے پیغمبر آپ ان سے) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ نزدیک ہے یا میرا رب اس کے لئے لمبی مدت مقرر فرماتا ہے وہی عالم الغیب ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا مگر جس رسول کو (اس کام کے لئے) پسند فرمالے، تو اس کے آگے اور پیچھے محافظ بھیج دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مشرکین مکہ اور کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت اور عذاب کے معین وقت بتلانے پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ قیامت کا آنا وہاں جزا و سزا کا ہونا تو یقینی ہے لیکن قیامت اور عذاب کے وقوع کی متعین تاریخ اور مدت کون سی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس لئے میں نہیں جانتا کہ وہ روز قیامت اور عذاب قریب آچکا ہے یا میرا رب اس کے لئے کوئی دور کی مدت مقرر کرے گا اور اس پر یہ دلیل پیش کی کہ قیامت اور عذاب کے معین وقت سے میری بے خبری اس لئے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں، بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے اور وہ علم غیب کلی جس سے عالم کائنات کا کوئی ذرہ پوشیدہ نہ ہو جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی کو ایسے غیب پر قبضہ اور قدرت نہیں، جس سے سارے کلیات جزئیات اور غیبی امور اس کے معلوم ہو جائیں البتہ جس کو اللہ تعالیٰ منصب رسالت و نبوت کے لئے پسند فرماتے ہیں تو اسے بقدر ضرورت امور غیبیہ کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور ان معلومات غیبی اور خبروں کو محفوظ ترین طریقے سے اپنے بندے کو پہنچا دینے کے لئے ان کے نزول کے وقت فرشتوں کا پہرہ اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں تاکہ وحی الٰہی ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہے اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے علم میں شک و شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں استثناء الا من ارتضیٰ میں غیب کلی اور تمام امور غیبیہ مراد نہیں بلکہ وہ امور غیبیہ اور احکامات شرعیہ مراد ہیں جن کا تعلق منصب رسالت اور نبوت سے ہے جیسا کہ اس سے پہلے آیت کریمہ سے یہ

واضح ہے اور اس طرح اس کی بعد والی آیت میں اس کی وضاحت موجود ہے چونکہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (الجن آیت ۲۸) تاکہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے اور درحقیقت میں پہلے ہی سے، اللہ تعالیٰ ان تمام احوال کا احاطہ کئے ہوتے ہیں اور اس نے ایک ایک چیز کو گن رکھا ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ منصب نبوت و رسالت کا تعلق چونکہ شریعت و احکام کی تبلیغ سے ہے اس لئے اس کے کچھ کلیات کا علم بقدر ضرورت انبیاء علیہم السلام کو دیا جاتا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس علم کی انتہا کی اور نبوت کو ان پر ختم کیا چنانچہ انہی کلیات سے ہر زمانے میں ان کے وارثین علماء کرام پیش آنے والے واقعات کے احکامات نکال لیتے ہیں اور یہی سلسلہ تاقیامت جاری وساری رہے گا جس کی وجہ سے نہ کسی نئے نبی کی ضرورت ہے اور نہ اس کے آنے کا امکان۔

پوشیدہ اشیاء کی چند ضروری اقسام کے بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تکوینیات کا علم ہو یا اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی مرضیات نامرضیات کا علم ہو، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور ان کا علم کلی تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا نہیں فرمایا البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے ضرورت کے مطابق جزوی طور پر اپنے بندوں کو علم عطا فرماتا ہے پھر وہ اپنے علم غیب میں سے احکام شرعیہ تو صرف انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی بتلاتا ہے اور تکوینی امور غیبیہ میں سے (جیسا کہ چوتھی قسم میں بتلائی گئیں) خاص خاص واقعات اور آئندہ آنے والے حالات کا علم جزئی بھی انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی یا اولیاء کرام کو بذریعہ الہام جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے عطا فرماتا ہے جو منجانب اللہ تعالیٰ عطا کیا ہوا علم ہوتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ

اِلَّا بِمَا شَآءَ (البقرہ آیت ۲۵۵) یعنی جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس کے پیچھے ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ مخلوقات (میں سے کوئی بھی) اس کے علم سے کسی چیز پر بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ جس قدر علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے (صرف اتنا ہی علم ان کو ہو سکتا ہے)

اسی طرح جب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو کفار و مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ کیا رسول ایسا ہوتا ہے جو انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے غرض وہ ہر اس چیز کو دیکھ کر اعتراض کرتے تھے جو لوازماتِ بشریت اور انسانی زندگی کے لئے از بس ضروری ہے، ان کفار و مشرکین کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوازماتِ بشریت سے مستغنی اور مافوق البشری قوتوں کا مالک ہو، کائنات کا ایک ایک ذرہ اس پر روشن ہو، ماضی اور مستقبل کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس لئے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کی فرمائشیں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ہم تب مانیں گے اگر آپ ان خشک پہاڑوں کو ہموار اور سرسبز زمین میں تبدیل کر دیں، اس میں ایسے چشمے اُبلنے لگیں جن میں سے ندیاں اور نہریں جاری ہوں وغیرہ وغیرہ۔ نیز وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قسم قسم کے غیبی امور بتلانے پر بھی اصرار کرتے تھے تو ان سارے بے ہودہ سوالات اور بے جا فرمائشوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الاحقاف آیت ۹) یعنی آپ ان سے کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور میں (اپنے عقل و فہم سے) نہیں جان سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہو گا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں صرف ایک صاف صاف ڈرانے (خبردار کرنے والا) ہوں۔ اس آیت کریمہ کا

مطلب یہ ہے کہ آپ ان کفار و مشرکین سے کہہ دیں کہ میری رسالت و نبوت دنیا کی تاریخ میں پہلا واقعہ نہیں کہ تمہیں خدا کے رسول پہچاننے میں پریشانی ہو بلکہ مجھ سے قبل بہت سے انبیاء و رُسُل دنیا میں آچکے ہیں جن میں بعض کو تو تم بھی مانتے ہو اور تم کو اُن سے عقیدت بھی ہے، آخر وہ بھی تو انسان و بشر تھے، کھاتے پیتے تھے آخر اُن میں سے کون سا رسول ایسا گزرا ہے جس نے اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھایا ہو یا اُس نے بالخود اپنے ذاتی علم سے سب کچھ جانا ہو۔ اگر ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو پھر میری رسالت و نبوت کو پرکھنے کے لئے ایسی نرالی اور انوکھی کسوٹی تم کہاں سے لاتے ہو، پھر اس کے بعد مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ۔ الآیۃ سے رسالت اور نبوت کی حیثیت تبلائی کہ میں اپنی عقل و شعور اور قیاس سے نہ یہ جانتا ہوں کہ آخرت میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ میں یہ جان سکتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا اور مجھ پر ایمان لانے والوں کا اور میری اس دعوت کا انجام کیا ہوگا اور تمہارے ان مظالم اور زیادتیوں کی تمہیں کب اور کیسی سزا ملے گی، غرض دنیا و آخرت کے امور غیبیہ سے متعلق وحی الٰہی کے بغیر[1] مجھے کوئی علم (جسے یقین کہا جاتا ہے) نہیں خواہ وہ میری ذات سے متعلق ہو یا دوسرے لوگوں (مومنین اور کفار و مشرکین) سے متعلق، خواہ وہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا، تفصیلی ہو یا اجمالی اس کی مجھے کچھ خبر نہیں، اور یہ امور آخرت (برزخ جنت و دوزخ، حساب و کتاب، مشرکین و کفار کے لئے سزا اور مومنین کے لئے جزا۔) سے متعلق یا دنیا میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جو کچھ بیان کرتا ہوں یہ میری عقل، فہم و ذہانت کا اثر نہیں بلکہ امور غیبیہ کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اور میں اس کی اتباع

---

[1] یعنی میں نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ میں خود بخود سب کچھ جانتا ہوں اور نہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدائی اختیارات میرے ہاتھ میں ہیں، تو جب میں نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو آپ کے سوالات اور فرمائشیں بے جا اور بے وزن ہیں کیونکہ عالم الغیب اور تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اس کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے میں اس کی پیروی اور تعمیل کرتا ہوں۔

اور پیروی کرتا ہوں۔

بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی وہ بتلادیا ہے جو پوری کائنات میں نہ کسی نبی، مرسل کو عطا فرمایا ہے اور نہ کسی مقرب فرشتے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ رسالت و نبوت کو ختم فرمایا اور آپ پر رسالت و نبوت کے کمالات اور آپ کی شایان شان علوم کی انتہا کی۔

حضرت علامہ آلوسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسی آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:۔

والذی اختارہ ان المعنی علی نفی الدرایۃ من غیر جہۃ الوحی سواء کانت الدرایۃ تفصیلیۃ او اجمالیۃ وسواء کان ذالک فی الامور الدنیویۃ او الاخرویۃ واعتقد انہ صلی اللہ علیہ وسلم لم ینتقل من الدنیا حتی اوتی من العلم باللہ تعالیٰ وصفاتہ وشؤنہ والعلم باشیاء یعد العلم بہا کمالا ما لم یؤتہ احد غیرہ من العالمین ولا اعتقد فوات کمال لعدم العلم بحوادث دینویۃ جزئیۃ کعدم العلم بما یصنع زید مثلاً فی بیتہ وما یجری علیہ فی یومہ او غدہ، ولا اری حسناً قول القائل انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام لیعلم الغیب، واستحسن ان یقال بدلہ انہ صلی اللہ علیہ وسلم اطلعہ اللہ تعالیٰ علی الغیب او علمہ سبحانہ ایاہ او نحو ذالک، وفی الآیۃ رد علی من ینسب لبعض الاولیاء علم کل شئ من الکلیات والجزئیات وقد سمعت خطیبا علی منبر المسجد الجامع المنسوب للشیخ عبد القادر الکیلانی قدس سرہ یوم الجمعۃ، قال باعلی صوت یا باز! انت اعلم بی من نفسی، وقال لی بعض انی لاعتقد ان الشیخ قدس سرہ یعلم کل شئ منی حتی منابت شعری، ومثل ذالک مما لا ینبغی ان ینسب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکیف ینسب الی من سواہ؟ فلیتق العبد مولاہ اہ

(روح المعانی ص ۱۰ ج ۲۶۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ)

یعنی میرے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہاں ایسی درایت اور جان لینے کی

نفی ہے جو بغیر کسی وحی کے خود بخود ہو، خواہ تفصیلی ہو یا اجمالی، خواہ وہ دنیا کے واقعات سے متعلق ہو یا اس کا تعلق آخرت کے حالات سے ہو، اس کے بعد علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ، میرا اعتقاد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک دنیا سے انتقال نہیں فرمایا جب تک اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے شئون کا علم نہ دے دیا گیا ہو اور ان اہم اشیاء (یعنی دنیا و آخرت میں آئندہ پیش آنے والے اہم واقعات) کا علم بھی، جن کا علم کمال سمجھا جاتا ہے، جو پوری کائنات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کو عطا نہیں کیا گیا اور میرا یہ اعتقاد نہیں کہ جزوی واقعات اور حادثات جیسے مثلاً زید اپنے گھر میں کیا کام کرتا ہے اور اس پر آج اور کل کیسے گزرے گی، علم نہ ہونے کی وجہ سے کمالِ نبوت میں فرق آتا ہے اکیونکہ اسی طرح غیبیہ امور کا علم نہ کوئی کمال ہے اور نہ اس کے نہ ہونے سے کمالِ نبوت میں فرق آتا ہے، (وہ فرماتے ہیں کہ) میں کسی شخص کے اس قول کو اچھا نہیں سمجھتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے (اور تقاضائے ادب کی وجہ سے بلاضرورت ایسا کہنا بھی مناسب نہیں کہ آپ غیب نہیں جانتے تھے) بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی چیزوں پر مطلع کیا تھا یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی امور بتلائے تھے یا اسی طرح کسی دوسرے الفاظ میں کہیں (جس میں نہ تو بے ادبی کی شان پائی جائے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائی اختیارات کا مالک ٹھہرا کر ان کے اس فرمانِ عالی کی مخالفت کی جائے کہ لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ بن مریم وقولوا عبد اللہ ورسولہ (خبردار! مجھے حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے (حضرت) عیسیٰؑ کو بشریت سے خارج کر کے خدا کہہ کر حد سے بڑھایا تھا (سن لو) مجھے تم اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا) پھر اس کے بعد علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ، اس آیت میں ان لوگوں کے نظریہ کی تردید ہے جو بعض اولیاء کی طرف تمام کلیات وجزئیات کے علم کو منسوب کرتے ہیں، لے جامع مسجد جسے شیخ عبد القادر گیلانی قدس سرہٗ کی مسجد سے موسوم کیا

جاتا ہے۔ جمعہ کے دن اسی مسجد کے منبر پر بیٹھے ہوئے خطیب سے سنا، وہ بلند آواز سے پکار کر کہہ رہے تھے۔ اے باز آپ (یعنی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) میری جان پر مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور بعض نے مجھ سے کہا کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ شیخ (عبدالقادر گیلانی، قدس سرہ میرے جسم کی ہر ہر چیز پر علم رکھتے ہیں حتیٰ کہ میرے بال کی جڑوں سے بھی ان کو واقفیت ہے (تو علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ) اس طرح کا علم تو ایسا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی منسوب نہیں کرنا چاہیئے چہ جائیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کو، (تو ایسے کہنے والے بندے کو چاہیئے کہ اس طرح کہنے میں، اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔

حاصل یہ کہ تمام غیبی امور کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے اور وہی عالم الغیب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض جاہل عوام جب یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو وہ ان کے ساتھ یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی غیب کی چیز کی خبر بھی نہیں ہوگی یہ تو نبوت اور رسالت کی نفی و انکار ہے حالانکہ غیبی خبر اور غیب میں فرق واضح ہے۔ اگر کوئی آپ کے کان میں کوئی راز کی بات کہہ دے تو کیا اس سے آپ عالم الغیب بن گئے بلکہ یہ تو چھپی ہوئی خبر ہے جو آپ کو بتلائی گئی۔ اسی طرح کسی بھی نبی مرسل کو اللہ تعالیٰ کا لاکھوں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب اور ذرائع سے عادۃً حاصل ہو جاتا ہے غیب نہیں، اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ وحی یا کسی ولی کو بذریعہ کشف والہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دے دیا گیا وہ علم غیب کی حدود سے نکل جاتا ہے اسی طرح جو شخص اسباب و ذرائع، آلات و تجربات و مشاہدات اور دلائل سے کوئی علم حاصل کرتا ہے، اس شخص کو عالم الغیب نہیں کہتے جیسے ریاضی کے قواعد سے کوئی حساب و مقدار معلوم کرلے یا طب، حکمت، نفسیات منطق، فلسفہ، سائنسی ایجادات، ریڈیو، وائرلیس وغیرہ کے ذریعے کوئی چیز معلوم کرے

تو وہ غیب کا جاننے والا نہیں، اسی طرح کشف والہام یا وحی کے ذریعے کسی کو بعض چیزوں کا علم ہو جاتے تو اس علم کو قرآن مجید میں انباء الغیب (یعنی غیب کی خبریں) کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ یعنی یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ عالم الغیب تو وہی ہوتا ہے جس کا علم ہر واسطہ، وسیلہ، سبب، آلات اور دلیل وغیرہ سے بے نیاز ہو اور وہ علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ پوری کائنات میں ہر مادہ کے رحم میں جو حمل ہو ہر ایک کو ہر وقت جانتا ہے کہ نیک ہو گا یا بد، خوبصورت ہو گا یا بدصورت، نیک بخت ہو گا یا بد بخت، عمر اس کی کتنی ہو گی۔ غرض مستقبل میں اس پر جو حالات اور عوارضات وارد ہونے والے ہوتے ہیں وہ تفصیل کے ساتھ ان سب کو جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو ان تمام اشیا کے احوال اور حقائق کا جاننے والا ہے جو کائنات میں کبھی یا اب ہیں یا مستقبل میں ہوں گے۔ غرض اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ازل سے ابد تک بلا واسطہ ہر چیز کا مکمل علم ہے، جملہ کائنات میں جتنے ذرات ہیں ان تمام کی کل تعداد اور وزن سے اُس کو واقفیت ہے، ساری دنیا کے سمندروں، دریاؤں وغیرہ میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اس کے علم میں ہے، ہر بارش کے قطروں اور تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کی تعداد اور ان میں باریک لکیروں میں سے کوئی لکیر اس سے کسی وقت مخفی نہیں رہ سکتی، ہر درخت کا ہر پتا گرنے سے پہلے اور گرنے کے بعد اور ہر درخت پر لگا ہوا پتا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہو گا، کب اور کہاں گرے گا اسی طرح ہمیشہ ہر چیز کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے حین حیات میں اور اس کے مرنے کے بعد اپنے علم تفصیل سے جانتا ہے[1]

---

[1] اللہ تعالیٰ کا علم اور دیکھنا ایسا نہیں کہ ایک آن میں ایک یا چند کا معائنہ کرلے یا دیکھ لے اور دوسرے وقت میں دوسری اشیاء پر نظر اور توجہ دے جس طرح انسانوں اور دوسری مخلوقات کا حال ہے بلکہ ازل سے ابد تک کی تمام چیزیں ساری کی ساری اس کے سامنے ایسی دائمی مستحضر ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی ذرہ یا کسی مخلوق کا خیال وغیرہ اس سے چھپ نہیں سکتا۔

اس کا علم اور مشاہدہ ہر آن کائنات کے ایک ایک ذرے کو محیط ہے اور کوئی ذرہ اس سے کسی وقت بھی پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر شے کی صفات، خواص، کیفیات وزن، مقدار، تعداد، شمار بلا واسطہ جانتا ہے۔ وہ ان چیزوں کے جاننے میں کسی واسطے اور آلے کا محتاج نہیں، اور اس کا یہ علم اپنا ذاتی ہے۔ کسی نے اس کو سکھایا نہیں، نیز اللہ کا علم لامحدود اور بے نہایت ہے۔ تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے وہ مقدر اور محدود ہے، اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ عالم تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ علوم عطا فرمائے جو کسی مقدس نبی، مقرب فرشتے بلکہ تمام مخلوقات میں سے کسی کو عطا نہیں کئے گئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اس کے حقوق اور قانون کا علم، ماضی، مستقبل کے لاکھوں واقعات برزخ و قبر کے حالات، جنت، دوزخ اور آخرت کا علم غرض وہ تمام علوم جو آپ کی شایان شان تھے عطا کئے گئے لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم، تمام انبیاء علیہم السلام فرشتے، جن وانس اور تمام اولین، آخرین کو جتنا علم عطا کیا گیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے علم محیط سے کوئی نسبت نہیں۔ صحیح بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو دریا کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ما علمی وعلمك من علم اللہ الا مثل ما نقص ھذا العصفور من ھذا البحر (کتاب التفسیر بخاری باب الکہف ج ۲ ص ۶۹۸) اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرے اور آپ کے علم کی مثال اس قطرے کی ہے جو اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔

یہ مثال محض سمجھانے کے لئے ہے ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم کے ساتھ کوئی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت علم پر اس کے دوسرے صفات کمالیہ کو بھی قیاس کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمالیہ اس کی ذاتی اور لامحدود ہیں، مخلوق میں جو بھی کوئی خوبی و صفت نظر آتی ہے وہ محدود اور صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی صفات میں سے کسی صفت کا مظہر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجرا میں کسی کو خود مختار ماننا شرک ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات میں کسی کو کسی درجہ میں شریک کرنا شرک ہے۔ اسی طرح یہ بھی شرک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجرا۔ اور نفاذ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو صاحب اختیار مانا جائے یعنی اگرچہ یہ مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے اور وہی قادر مطلق متصرف مطلق اور تمام صفاتِ کمالیہ میں یگانہ ہے۔ لیکن اگر مخلوق جیسے ملائکہ یا ارواح یا کسی انسان یا جن کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مستقل طور پر کچھ انتظامی امور سپرد کر دیتے ہیں جیسے بارش برسانا یا مافوق الفطرت طریقہ سے نفع و ضرر پہنچانا یا دعائیں قبول کرنا وغیرہ۔ اور یہ ان چیزوں کے نفاذ میں اس طرح خود مختار ہیں جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنے ماتحت حکام اور افسران کو کچھ انتظامی اختیارات دے دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ حکام ان اختیارات کے اجرا۔ اور استعمال میں خود مختار ہوتے ہیں۔ اور پھر نہ بادشاہ سے پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ اسے خبر ہوتی ہے اس لئے لوگ ماتحت حکام کو خوش کرنے کے لئے ان کو ہدایا دیتے ہیں۔ اور ان کی چاپلوسی کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے اختیارات اس کے بارے میں نافذ کریں۔ اس طرح کسی بھی مخلوق کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اللہ کی صفت کے اجرا۔ و نفاذ میں خود مختار ہیں تو یہ بھی شرک ہے[1]۔

---

[1] مسلمانوں کا یہ عقیدہ جو نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے انتظامات مثلاً بارش برسانا، مارنا وغیرہ ملائکہ کے سپرد کئے ہیں یہ شرک ہرگز نہیں کیونکہ مسلمان اللہ رب العزت کے سوا کسی اور کے لئے کسی باب میں بھی، ذرہ برابر مستقل اختیار ثابت نہیں کرتے ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور علم کے بغیر کوئی مخلوق کچھ نہیں کر سکتی حتیٰ کہ پتا بھی اگر کہیں گرتا ہے تو اس کے حکم سے اور اس کے علم کے مطابق گرتا ہے۔ اور یہاں ملائکہ وغیرہ کی حیثیت صرف غلاموں جیسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے مختلف غلاموں میں کام بانٹ دے کہ جب میں کسی کے لئے پانی دینے کا حکم کروں اس حکم کی تعمیل فلاں غلام کو کرنا ہوگی اور جب کھانے کے بارے میں آواز دوں تو فلاں غلام اس کام کو سرانجام دے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں پر جو خاص حقوق عائد ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی حق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے مانا جائے۔ مثلاً کسی مخلوق کی محبت اور تعظیم کو اللہ تعالیٰ و تبارک کے برابر سمجھنا۔ یا اس کی اطاعت میں کسی اور کو شریک کرنا جیسے کسی کے لئے ایسا مستقل اختیار ثابت کرنا کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکتا ہے (اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گی) اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک کرنا جیسے سجدہ، رکوع، نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ یا کسی مخلوق کو عالم اسباب کی چیزوں سے بالاتر اور اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ سمجھ کر اس سے مشکلات اور مصائب میں مدد مانگنا یہ سب شرک کی مختلف صورتیں ہیں۔

شرک جلی اور ایک شبہ کا ازالہ

مذکورہ بالا بحث سے یہ الجھن بھی دور ہو جاتی ہے کہ ہم دنیا میں بہت سی چیزوں سے فائدے اٹھاتے ہیں۔ مثلاً پانی سے پیاس بجھاتے ہیں اور روٹی سے بھوک دفع ہوتے دیکھتے ہیں۔ آگ سے گرمی اور دواؤں سے صحت کا حاصل ہونا نظر آتا ہے۔ علاج کے لئے حکماء اور ڈاکٹروں سے اور کام کاج میں نوکروں یا کاریگروں سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح غریب و محتاج لوگ امراء اور حکام سے مدد طلب کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ شرک کیوں نہیں؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) غرض تعمیل حکم کے لئے مختلف امور پر مختلف غلاموں کو لگا دیتے ہیں تاکہ افراتفری نہ ہو اور نظام باقاعدہ چلے۔ تو جب یہ شخص آواز دیتا ہے کہ فلاں کو اتنی مقدار پانی پہنچا دیا جائے تو پانی والا خادم اٹھ کر فوراً تعمیل کرتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی ملک کے بارے میں متعین مقدار بارش کا حکم فرماتے ہیں تو بارش کا فرشتہ حکم بجالاتا ہے۔ اگر حکم کر دے کہ فلاں شخص کی موت فلاں وقت فلاں جگہ واقع ہو تو موت کا فرشتہ اس کا انتظام کرتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے ذرہ ذرہ اور جملہ امور میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمان بارش برسانے، موت سے بچنے وغیرہ میں صرف اللہ تعالیٰ ہی سے درخواست کرتا ہے نہ کہ بارش برسانے پر مامور فرشتہ وغیرہ کو پکارتا ہے۔

اس لئے کہ عالم اسباب کی ان اشیاء میں اللہ پاک نے خاصیتیں اور تاثیریں رکھ دی ہیں، پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر، آگ میں گرمی اور روشنی کی خاصیت اور دواؤں میں امراض دور کرنے کی قوت۔ ان خواص اور تاثیروں میں خود ان اشیاء کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ ان چیزوں کی حیثیت ہمارے نوکروں کی سی ہے اور ان سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے ہم اپنے جانوروں یا اوزار و مصنوعات سے کام لیتے ہیں، ان سے کام لینے میں شرک کی کوئی وجہ نہیں۔

پھر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی قابلیت دے رکھی ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے انسانوں کو کوئی فائدہ یا امداد پہنچا سکتے ہیں مثلاً حکیم یا ڈاکٹر، امیر یا حاکم یا کاریگر وغیرہ۔ ان کے بارے میں ہر سلیم العقل آدمی جانتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں ہوتی، اور ان کے قبضہ میں کچھ نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ وہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کے محتاج بندے ہیں، بس بات اتنی سی ہے کہ اللہ نے اس عالم اسباب میں انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے کسی ضروری کام میں مدد لے سکتے ہیں، پس ان سے مدد حاصل کرنے یا کام لینے میں شرک کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ شرک تو تب ہوتا ہے جب کسی کو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ظاہری اسباب کے سلسلہ سے بالاتر یعنی غیبی طور پر اپنے ارادہ اور اختیار سے کار فرما اور متصرف سمجھا جائے۔ پھر اسی عقیدہ کی بناء پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے اور اسے راضی کرنے کے لئے اس کی عبادت کی جائے اور ایسے شرک عظیم کو شرک جلی کہتے ہیں۔

معجزات و کرامات صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں

بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ایسے کام عالم وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں جنہیں معجزات کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ سے بھی بعض اوقات ایسے بہت سے کام صادر ہوتے ہیں جو خلاف عادت ہوتے ہیں، ان کو کرامات کہتے ہیں جس سے سرسری نظر

سے دیکھنے والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار انہیں سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھوں سے کیسے یہ کام وجود میں آتے؟ جس سے وہ ان انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کے لئے ایک درجے میں مختار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ معجزہ و کرامت کی حقیقت بیان کی جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ معجزات و کرامات بھی صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار سے وجود میں آتے ہیں۔

معجزہ کی حقیقت

معجزہ لغت میں عاجز کر دینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اور اصطلاح میں معجزہ ایسے عمل کو کہتے ہیں جو کسی پیغمبر سے بغیر کسی سبب طبعی کے عالم وجود میں آئے اور اگر ایسا کوئی کام ولی اللہ کے ذریعے وجود میں آئے تو اسے کرامت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو معجزے دے کر لوگوں کو اپنے احکامات کی طرف بلانے پر مامور فرماتے اور ان معجزات سے مقصود ان کی رسالت و نبوت کی تصدیق کرنا ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکے وہ انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہو تاکہ عوام سمجھ لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننا اور اس کے بتلائے ہوئے عقیدے کے مطابق اور اس کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل ہے اور جو منکرِ حق اسے نہ مانتے ہوں ان پر حجت تام ہو اور وہ مستحقین عتاب بن جائیں۔

پچھلے انبیاء علیہم السلام کو عموماً وہ معجزے دیئے گئے جو عملی اور مشاہد نظر آنے

لہٰذا یعنی عملی اور مشاہد تو ایسے ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور یہ کلام علمی معجزہ ایسا ہے جو قیامت تک ہر وقت ہیں ہر شخص پر حجت تام ہے جیسا عصا۔ اور ید بیضا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت و نبوت کی دلیل تھے لیکن ان کے تشریف لے جانے کے بعد وہ موجود نہیں لیکن قرآن مجید ہر وقت پکار کر اعلان فرماتا ہے کہ مجھ جیسا کلام پیش کرو ورنہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ اس کی مزید تفصیل کے لئے کتاب ذہریت سے اسلام تک، باب حقانیت اسلام کو ملاحظہ کیجئے۔

والے تھے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی ہوئی آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی غیر مضر ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا۔ اور ید بیضا۔ وغیرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادرزاد نابینا اور کوڑھیوں کو تندرست کر دینا، مُردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں ایک طرف ہزاروں عملی اور مشاہد معجزات دیئے گئے جس کی وجہ سے عہد مبارک میں مسلمانوں کا ایمان و ایقان پختہ اور غیر متزلزل ہو کر قدسیوں کی ایک ایسی عظیم جماعت تیار ہوئی جن کے ایمان میں شک کرنا بلکہ ان پر تنقید کرنا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے تو دوسری طرف رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے ایک ایسا کلام علمی معجزہ (قرآن مجید) عطا فرمایا جو لاکھوں عملی اور مشاہد معجزوں سے بڑھ کر ہے جو بیک وقت عقل اور دل دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی حقانیت پر دلائل پیش کرنے کی مثال سورج کے روشن ہونے پر دلائل قائم کرنا ہے اور یہ ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے اور قیامت تک کے انسانوں کے لئے پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے کی بجائے صرف قرآن مجید کی چھوٹی سی سورت کی مثال پیش کرنے کا چیلنج ہے اور تمام انس و جن اکٹھے ہو کر بھی اس کی مثال لانے سے قاصر و عاجز ہیں۔

معجزہ کا حکم ہر خاص و عام کے لئے یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ انبیاء و رسل سے جو معجزات یقینی طور پر ثابت ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر آگ کا ٹھنڈا اور غیر مضر ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے عصا۔ اور ید بیضا۔ وغیرہ کے معجزے[1] جن کا ثبوت اور دلالت دونوں قطعی اور یقینی ہیں وہ حق ہیں اور ایسے

---

[1] ثبوت کا یقینی ہونا یہ ہے کہ اس امر کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہو یا اس کا علم ہمیں متواتر حدیث شریف سے حاصل ہو چکا ہو اور اس کی دلالت کا یقینی ہونا یہ ہے کہ اس کے معنی میں بھی کوئی ابہام نہ ہو اور نہ اس میں کسی دوسرے معنی کا احتمال ہو پس جو لوگ فی الجملہ معجزات کو مانتے ہیں مگر کسی ایسے واقعہ کا ظہور جس سے ان کا معجزہ ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں بلکہ اس میں معجزہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

معجزات پر ایمان لانا اُن کے وجود اور ان کی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی حقیقت میں اسلام اور قرآن سے انکار ہے۔

یقینی معجزوں کو دائرہ اسباب سے جوڑنے کی مذمت

بعض نام نہاد مسلمان جن کے دماغ پر مغربی دنیا کی مادہ پرستی اور مادی ترقی اور سائنسی برتری کا بُت مسلط ہو چکا ہے، وہ قرآن مجید میں مذکور ایسے واقعات جن کا ظہور دنیا میں یقیناً بغیر کسی طبعی سبب کے ہوا ہے یعنی ایسے یقینی معجزات کو کسی نہ کسی طرح ایسے واقعات بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا وقوع اسباب طبعیہ کے تحت ممکن ہو۔ یہ حضرات ایسے واقعات کو عادی واقعات بنانے میں کسی بھی تحریف، تبدیلی سے نہیں چوکتے۔ خواہ ان کو صحیح احادیث کا رد کرنا پڑے یا قرآن کے سیاق وسباق کو چھوڑنا پڑے، خواہ قرآن مجید کی دوسری محکم آیات کریمہ کو نظر انداز کرنا پڑے کیونکہ ان حضرات کا رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کو قرآن، سنت کے مطابق بنانے کی بجائے قرآن، سنت کو اپنے نظریات کے تابع بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ یہ سب یا تو اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں کوئی روشن خیال انہیں قدامت پسندی کا طعنہ نہ دے دے یا اُن کا خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مغربی نظریات سے قرآن، سنت کو ہم آہنگ کیا جائے تاکہ ان سے داد اور دنیاوی مفادات حاصل کریں یا اگر ہم ان سے حسن ظن رکھ کر ان کے بارے میں یہ گمان رکھیں کہ ان کا اس طرز عمل سے مراد یہ ہے کہ اس سے نام نہاد عقلیت پسند اور مستشرقین کے بیہودہ اعتراضات کا جواب ہو جائے گا تو پھر یہ یقیناً قرآن اور اسلام کے ایسے نادان دوست اور ہمدرد ہیں کہ ان کی دوستی اور ہمدردی دشمنان اسلام کے تعصب، عداوت سے لاکھوں گنا بڑھ کر خطرناک ہے کیونکہ غیر مسلم کی کھلی مخالفت اور فریب دہی سے عوام کا بچنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس ایک شخص سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور غیر معجزہ دونوں کا قوی احتمال موجود ہے اس کو وہ دائرہ اسباب سے جوڑ دے تو ایسے شخص کو خواہ مخواہ منکر معجزات وکرامت کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی عقائد اور اعمال کو مسخ کر دیتا ہو۔

معجزہ سے انکار کی وجہ جو لوگ معجزات کے سرے سے قائل نہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے منکر ہیں اور بعض لوگ اگرچہ خدا کو تو مانتے ہیں لیکن ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا فرما کر اس کے نظم کو ایک قانون پر چلا دیا۔ اس کے بعد کائنات کے نظم و تدبیر میں اس کا کوئی دخل نہ رہا۔ وہ الگ تھلگ بیٹھ کر ایک بے بس تماشائی کی طرح کائنات کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایسے لوگ جب کسی خرق عادت واقعہ جو دائرہ اسباب سے ماوراء ہو کے متعلق سنتے ہیں تو اس کو ایک افسانہ باور کر کے رد کر دیتے ہیں اور اگر کہیں وہ ایسے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں تو اسے دائرہ اسباب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے تعطل کے قائل ہو کر برائے نام ایسے بے اختیار اور بے قدرت خدا کو مانتے ہیں، جو کمزور ترین انسان سے بھی زیادہ لاچار و بے اختیار ہو جو درحقیقت خدا کے نہ ماننے کے مترادف ہے۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی تخلیق کی، وہی قادر مطلق ہے، تمام اختیارات کا مالک صرف وہی ذات ہے وہ کائنات کی تدبیر و انتظام خود کرتا ہے، پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کی مشیت کے تحت ہوتا ہے حتیٰ کہ کسی درخت کا پتا بھی اس کے اذن کے بغیر جنبش تک نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمام اشیاء کو پیدا فرمایا اور ان میں خاصیتیں رکھ دیں۔ تو جس طرح یہ اشیاء خود اپنے وجود اور بقاء میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اسی طرح ان کے خواص بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اپنے نفع و ضرر پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ اگرچہ ان خاصیتوں کے لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عام قانون اور معمول یہی رکھا ہے کہ وہ اپنی خاصیتوں پر قائم رہیں مثلاً آگ میں جلا دینے کی خاصیت ہے جو

---

[1] مزید تفصیل کتاب "دہریت سے اسلام تک" میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور اس کا عام معمول یہ ہے کہ جو بھی آتش پذیر چیز اس میں پڑ جائے تو جل جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہے اس کی اس خاصیت کو خاص حالت میں سلب کر لے اور اس کے عام معمول کو بدل دے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈال دیا گیا تو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے آگ کو حکم فرمایا کہ یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ (سورۃ الانبیاء۔ آیت نمبر ۶۹) اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا ابراہیم پر۔ تو وہ ٹھنڈی اور غیر مضر بن گئی کیونکہ تمام اشیاء کی خاصیتیں اور معمول اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں وہ جس وقت جس چیز کی خاصیت اور معمول کو بدلنا چاہے بدل سکتا ہے جیسا کہ یہاں آگ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی جلانے کی خاصیت چھوڑ دی اور گلزار بن گئی، اسی طرح وہ جب چاہے اشیاء کی شکلوں کو اور واقعات کی جاری رفتار میں جزوی یا کلی طور پر جیسا چاہے تغیر کر سکتا ہے کیونکہ صرف وہی تمام چیزوں کا خالق و مالک ہے۔

معجزہ اور کرامت کی حیثیت جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ معجزہ اور کرامات بغیر کسی طبعی سبب کے اللہ تعالیٰ کے حکم سے خلاف عادت وجود میں آتے ہیں اس لئے معجزات و کرامات براہ راست حق تعالیٰ شانہٗ کا فعل مانا جاتا ہے۔ صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی صداقت اور عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا یُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (الانعام آیت ۱۰۹) یعنی اور وہ (منکرین حق) اللہ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) آ جائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے نشانیاں (معجزے) تو اللہ کے اختیار میں ہیں اور (اے مسلمانو) تمہیں (ان منکرین حق کا حال) معلوم نہیں کہ اگر ان کے سامنے نشانیاں (معجزے) آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں۔

اور ایک جگہ سابقین انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آنے والے حالات کو بیان کرکے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ۔ (المومن آیت ۷۸) یعنی اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی (معجزہ) لا سکے، پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزول عذاب) آپہنچا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت (اللہ کے پیغمبروں کے جھٹلانے والے خسارہ میں پڑ گئے۔

غزوۂ بدر کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین کے لشکر کی طرف ایک مٹھی بھر خاک اور کنکری پھینک دی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہر لشکری کی آنکھ میں جا لگی۔ اس واقعہ کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال آیت ۱۷) یعنی خاک یا کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی حقیقت میں (اے آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے یہ مٹھی بھر خاک اور کنکری اگرچہ آپ کے ہاتھ سے پھینکی گئی۔ لیکن اس مٹھی بھر کا اثر کفار و مشرکین کے تمام لشکر کی آنکھوں میں پہنچا دینا اس میں آپ کے عمل کا کوئی دخل نہیں یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل تھا کہ اس نے اپنی قدرت سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرکے یک لخت مٹھی بھر خاک اور کنکریوں کو دشمن کے سارے مجمع تک پہنچا دیا اور ان میں سے ہر ایک کی آنکھ میں اس کا اثر پہنچا دیا۔

اسی طرح بہت سی آیات کریمہ اس پر شاہد ہیں کہ کوئی پیغمبر خدا یا کوئی ولی اللہ جب چاہے، جو چاہے معجزہ یا کرامت دکھا دے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے کفار و مشرکین نے بہت سے متعین معجزات کی فرمائش کی مگر جس معجزہ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے چاہا اس کو ظاہر کر دیا اور جس کا ظہور نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔

غرض معجزات و کرامات اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں۔ ان

کے ظہور میں نہ کسی ولی اللہ کو اختیار ہوتا ہے اور نہ کوئی نبی و رسول اس کے پیش کرنے میں خود مختار ہوتا ہے۔

البتہ انبیاء علیہم السلام کی عظمت و احترام ہم پر لازم ہے کیونکہ معجزات و کرامات کا صدور انبیاء و اولیاء ہی سے ہوا کرتا ہے۔ یہ ان کی صداقت عظمت ثابت کرنے کے لئے اور ان کی تائید کے لئے ہوتے ہیں۔ انہی کے واسطہ سے ان کا ظہور ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے ہم تک اللہ تعالیٰ کی رضا کے اعمال اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پہنچتے ہیں۔

معجزہ اور جادو میں فرق

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں، جو عام عادت کے خلاف ہوا کرتے ہیں۔ بظاہر سحر و جادو سے بھی ایسے ہی آثار و اعمال ظاہر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض کم فہم لوگ دونوں میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے جادوگروں کی پیغمبروں جیسی تعظیم کرتے ہیں۔ حالانکہ سحر و جادو اور معجزات و کرامات میں آسمان و زمین کا فرق ہے سحر و جادو، مسمریزم، ہپناٹزم، ٹونے ٹوٹکے[1] وغیرہ سے جو چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ سب اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے اسباب مخفی ہوتے ہیں، جو عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے اس لئے عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی طبعی سبب کے ہو گیا۔ حالانکہ ان اشیاء سے ظاہر ہونے والے مشاہدوں کے اسباب اہل فن پر مخفی نہیں ہوتے۔

دائرہ اسباب کی اقسام

اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اسباب طبعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری اسباب اور مخفی اسباب۔ ظاہری اسباب سے جو چیزیں ظہور میں آتی ہیں، چونکہ ان کے اسباب ہر کسی پر عیاں ہوتے

---

[1] کسی انسان کے بال یا ناخن وغیرہ یا اس کے استعمال شدہ کپڑے وغیرہ کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں ملا دیتے ہیں۔ اس کو ٹونہ ٹوٹکہ کہتے ہیں۔

ہیں۔ اس لئے یہ چیزیں کسی کے لئے قابل حیرت نہیں ہوا کرتیں۔ مثلاً گندم کی کاشت سے گندم کا پودا نکل آنا، اور اپنے وقت پر پکنا، کسی تیز رفتار سواری پر سوار ہوکر کسی جگہ جلد پہنچنا۔ یا جہاز میں اڑنا۔ جو شخص بھی گندم کاشت کرتا ہے وہ گندم حاصل کر سکتا ہے یا جو شخص جہاز میں سوار ہوتا ہے وہ طویل مسافت مختصر وقت میں طے کر سکتا ہے۔ لیکن اسباب مخفیہ سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں۔ اس کے اسباب خاص لوگوں کے علاوہ دوسرے عام لوگوں پر مخفی ہوتے ہیں۔ مثلاً سائنسی ایجادات، سحر جادو وغیرہ۔ ریڈیو پر آپ تقریر اور خبریں کیسے سنتے ہیں۔ وائرلیس پر بغیر کسی تار وغیرہ کے ہزاروں میل دور کی باتوں کو کیوں سنتے ہیں، یا مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم سے کسی کے خیال میں کوئی چیز ڈالنا یا اس کے خیال سے کسی چیز کا اچک لینا۔ تو اس کے اسباب اہلِ فن پر مخفی نہیں ہوتے۔ اور اس سے دفاع کرنے کی تدابیر اور طریقے بھی وہ خوب جانتے ہیں۔ اسی طرح اگر شیاطین یا جن کے ذریعے کسی کے پاس دور کسی چیز کی خبر پہنچ جائے، تو یہ اس شخص کے لئے تو قابل تعجب بات ہوا کرتی ہے جس کو اس کے اسباب معلوم نہ ہوں، لیکن اس آدمی کے لئے یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں جو شیاطین و جن کی حیثیت اور ان کی تیز رفتاری اور ان سے کام لینے کی چالیں سیکھ چکا ہو۔ یا کم از کم وہ اس سے باخبر ہو۔ اسی طرح اگر کوئی دوائی لگا کر اپنے کو فائر پروف کر کے آگ کے اندر چلا جائے یا اپنے ہاتھ وغیرہ کو آگ میں داخل کر کے پھر صحیح و سالم نکل آئے۔ یہ کام تو ایک عام شخص کو متاثر کر سکتا ہے لیکن خواص کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آگ سے جلنے کی خاصیت نہیں ختم ہو جاتی ہے اور نہ اس آدمی کا نہ جلنا کوئی معجزہ یا کرامت ہے، بلکہ دواؤں کے اثر سے وہ اپنے بدن کو آگ کی تپش سے محفوظ کر لیتا ہے اور جو بھی وہ دوائی استعمال کرے گا ایسی چال دکھلا سکتا ہے بخلاف معجزہ و کرامت کے کہ وہ بغیر کسی اسباب طبعی کے ہوتا ہے۔ جیسا کہ بغیر کسی سبب کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ٹھنڈی اور غیر مضر بنا دی اور آگ کو براہ راست حکم فرمایا

كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا. تو وہ جلنے کے باوجود گلستان میں بدل گئی۔ غرض جادو، ہپناٹزم، مسمریزم، ٹونے ٹوٹکے وغیرہ سے وجود میں آنے والی چیزیں دائرہ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں۔

بلکہ سائنسی مصنوعات کی طرح ان کے اسباب اہلِ فن کو معلوم ہوتے ہیں جیسے شیاطین و جن کو خوش کر کے ان سے کام لینا ہوتا ہے یا قوت نفسیہ یا حروف و کلمات[1] لکھ کر یا ان کا ورد کر کے اس کا ظہور ہوتا ہے، جو دوسرے لوگ بھی فن سیکھ کر دکھلا سکتے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں اصول و قوانین پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ہر وقت ایسی شعبدہ بازیاں دکھلا سکتے ہیں بخلاف نبی و پیغمبر کے کہ ان کا معجزہ کسی اصول و قوانین اور اسباب کی بنیاد پر ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ ان کا پیشہ ہوتا ہے بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی خاص قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عوام الناس معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ میں فرق کیسے کرینگے

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ و کرامت اور جادو وغیرہ کے فرق کو خواص تو سمجھ سکتے ہیں لیکن عوام جو ان مخفی اسباب سے بے خبر ہیں، وہ نبی اللہ، ولی اللہ اور جادوگروں میں فرق کیسے کریں گے؟ کیونکہ معجزہ و سحر وغیرہ دونوں کی ظاہری صورت تو تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حقیقت کے اعتبار سے معجزہ اور جادو میں آسمان و زمین کا فرق ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور جادوگروں میں ایسے واضح امتیازات رکھ دیئے ہیں، جن کی وجہ سے لوگ ان کے دھوکہ دینے سے بچ جاتے ہیں۔ اول یہ کہ معجزہ و کرامت کا صدور ایسے حضرات سے ہوتا ہے جن کا تقویٰ، صداقت، امانت، طہارت و پاکیزگی، اخلاق و اعمال ایسے بلند ہوتے ہیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی تو عام زندگی اسی طرح آزمائش و امتحانوں کی کسوٹی پر پرکھی گئی تھی

---

[1] حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثیرات ہوتی ہیں کسی خاص حرف یا کلمہ کو خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص تاثیرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

کہ ان کا کوئی شعبۂ زندگی ناقص اور قابلِ اعتراض نہ تھا اور ان کی تمام زندگی میں اخلاق کی بلندی اگناہوں سے معصومیت اور صداقت و کردار کا کمال لوگوں کے ہاں ایسا مسلم تھا کہ اگر وہ کوئی معجزہ نہ بھی دکھلاتے تب بھی ان کی پیغمبرانہ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت گزر رہی تھی اور ان کی تعلیمات عقلی دلائل کی روشنی میں اسی قدر صداقت پر مبنی تھیں کہ وہ راہ حق سے بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لئے ایک نسخۂ کیمیا اور دینی و دنیاوی فلاح کا سبب تھا۔ لیکن اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور میں آتا ہے جو عام لوگوں سے زیادہ گندے، ناپاک، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل اور اس کی عبادت سے دور رہتے ہیں۔ اور جو جادوگر گندگی اور ناپاکی میں جتنا زیادہ بلند ہو اس کا جادو اتنا ہی زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ تو آخر ایسی حالت میں وہ دوسروں کے لئے کیسے زندگی گزارنے کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ جس کی اپنی زندگی دوسرے انسانوں بلکہ حیوانات سے زیادہ پست اور گندی ہو۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ معجزہ کا توڑ لانا کسی بشر کی قدرت سے خارج ہوتا ہے بخلاف سائنسی مصنوعات اور جادو وغیرہ کے کہ اور لوگ بھی اسی طرح فن کو سیکھ کر اسے حاصل کر سکتے ہیں اور اس کا توڑ پیش کر سکتے ہیں۔ کوئی ایٹم بم کو بناتا ہے تو دوسرا یہ فن سیکھ کر وہ بھی اسی طرح یا اس سے اعلیٰ بم تیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی نے ریڈیو ایجاد کیا تو ہزاروں لوگوں نے مہارت حاصل کر کے اس سے اعلیٰ ریڈیو تیار کر لیا یہی حال جادو، ہپناٹزم، مسمریزم وغیرہ کا بھی ہے کہ کوئی یہ فن سیکھ کر یا اعمال نفسانی

لہ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں انبیاء علیہم السلام کی نصرت کے لئے معجزات بھی دے دیتے ہیں کیونکہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ سورج سے زیادہ روشن عقلی و نقلی دلائل کے باوجود عوام کی فطرت اکثر و بیشتر حق و صداقت کے قبول کرنے کے لئے دلائل سے زیادہ ایسے امور سے جلد متاثر ہوتی ہے جو عقل کو حیران اور دماغ کو مرعوب کر کے ان پر یہ ظاہر کر دے کہ دعوائے نبوت کے ساتھ نبی کا یہ عمل بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایسی طاقت رکھتا ہے جس کا مقابلہ انسانی طاقت سے باہر ہے اور ان کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ بندہ خدا کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے اس لئے یہ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کرتا ہے۔

کی مشق اور اس کے طریقے سیکھ کر دوسروں کی طرح یا ان سے اعلیٰ کام اور شعبدہ بازیاں دکھلا سکتا ہے۔ کیونکہ ان تمام اشیاء کا ظہور اسباب طبعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور ان کے اسباب سے اہل فن کو واقفیت ہوتی ہے، اور ہر ایک ماہر فن اپنے سے زیادہ باکمال کو پہچانتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون نے جب اپنے ملک کے تمام اعلیٰ ساحروں کو جمع کر دیا تو انہوں نے اپنی لاٹھیاں و رسیاں میدان میں پھینک دیں وہ بڑے بڑے سانپ نظر آنے لگے لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی عصا پھینک دی تو وہ اژدہا بن کر ان کے سارے سانپوں کو نگل گیا اور ان کے سحر کو توڑ دیا۔ یہ واقعہ دیکھ کر جادوگروں کو ماہرین فن ہونے کی وجہ سے فوراً یقین آ گیا کہ بلاشبہ یہ ان کے فن اور اسباب طبعیہ کے تحت ظہور پذیر ہونے والی چیز نہیں بلکہ یہ خالص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ ہے تو وہ بے ساختہ سجدے میں گر گئے اور سجائے اس طرح کہنے کے کہ ہم نے مان لیا کہ موسیٰ ہم سب سے زیادہ اعلیٰ اور باکمال جادوگر ہے یوں پکار اٹھے کہ ہم اس رب کو مان گئے جس نے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ و ہارون علیہما وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے۔

معجزہ اور جادو میں ہمارے علماء نے ایک فرق یہ بھی بتلایا ہے کہ نبوت کے دعوے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا نہیں۔ لیکن اگر یہ آخری وجہ نہ بھی ہوتی پھر بھی مذکورہ بالا دو وجوہ ایسی ہیں کہ جو ایک انسان کے لئے نبی و جادوگر میں فرق کرنے کے لئے کافی و شافی ہیں۔ لیکن یہ بات ایک مسلمہ امر ہے کہ اب تک کسی جادوگر نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ

لہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ العیاذ باللہ سائنس اور سحر وغیرہ جیسی چیزیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت سے بے نیاز ہو کر از خود موثر ہیں۔ یہ عقیدہ تو خالص کفر ہے کیونکہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت کام کر رہی ہیں اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کوئی چیز بھی نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان بلکہ یہاں تو مقصود یہ ہے کہ سائنس اور سحر وغیرہ سے جو مشاہدے ظہور میں آتے ہیں ان کا صدور بھی اسباب طبعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ان کے اسباب ایسے ہیں جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ اور اہل فن پر ظاہر ہوتے ہیں۔

نہیں کیا، اگر کبھی کسی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر بھی دیا تو پھر اس کا جادو اور اس کی پیشین گوئی اس کے منہ پر مار دی گئی۔

اصل حقیقت حقیقت اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ جو کچھ ہے وہ سب قادرِ مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، تمام چیزیں اور سارے منافع اور نقصانات جن کا ظہور ان اشیا سے دکھائی دیتا ہے اللہ کی طرف سے ہیں۔ اسی حقیقت کو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ساری دنیا کے جن اور انسان مل کر نہیں کوئی ایسا نفع پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر نہیں فرمایا تو ان کی کوئی مجال نہیں کہ پہنچا سکیں۔ اسی طرح اگر ساری دنیا کے جنات اور انسان مل کر تمہیں کوئی ایسا نقصان پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نہیں چاہا تو ہرگز نہیں کر سکیں گے۔

مشرکین کے عقائد مشرکینِ عرب میں سے اکثر یہ مانتے تھے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔ ایسا نہیں کہ کچھ چیزیں تو ایک نے پیدا کی ہوں اور کچھ کسی اور نے، قرآن مجید میں جا بجا اس کی شہادت موجود ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (سورۃ عنکبوت آیت ۶۱) اور اگر آپ ان مشرک لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے کام پر لگایا ہے تو اقرار کریں گے کہ اللہ نے (یہ سب کچھ کیا ہے)۔

اور اس کے علاوہ وہ لوگ اس بات کا اقرار بھی کرتے تھے کہ کائنات کا سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ ہی چلاتا ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی مارتا ہے اور زندگی بھی دیتا ہے، جیسا کہ سورت یونس میں ارشاد ہے، قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ (یونس آیت ۳۱) یعنی اے پیغمبر! آپ (ان مشرکین سے) پوچھئے

ذرا بتاؤ، کون تم کو روزی دیتا ہے، زمین و آسمان سے، یا کون کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور مردے کو زندہ سے اور کون ہے جو اس تمام کارخانۂ کائنات کی تدبیر (انتظام) کرتا ہے (تو آپ جب ان سے پوچھیں گے) تو وہ (صاف) بول اٹھیں گے کہ (یہ سب کچھ کرنے والا) اللہ ہے سو آپ (ان سے) کہئے پھر ڈرتے نہیں ہو؟

بلکہ مشرکین عرب کے متعلق قرآن شاہد ہے کہ جب وہ لوگ بحری سفر کرتے اور دریا میں طوفان کی صورت پیدا ہو جاتی تو وہ اپنے سب دیوتاؤں کو بھول جاتے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے اور اسی سے اپنی امیدیں لگا دیتے وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ (سورۃ الاسراء۔ آیت ۶۷) یعنی جب تم پر دریا میں آفت آتی ہے، جن کو تم پکارتے تھے (سب) بھول جاتے ہو سوائے اللہ کے۔

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (سورۃ لقمان آیت ۳۲) یعنی جب ان (مشرکین) کے سر پر (سمندر کی) موج بادل جیسے آئے (تو پھر) خالص اللہ ہی کے لئے بندگی کو خالص کرتے ہیں۔

بہرحال مشرکین عرب اگرچہ غیر اللہ کی پرستش کرتے تھے مگر یہ بالکل واضح اور یقینی ہے کہ وہ اپنے جھوٹے معبودوں کو خدا یا مثل خدا انہیں سمجھتے تھے، اور اپنے معبودوں کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے تھے۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے والد سے پوچھا اے حصین! تم کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو؟ میرے والد نے جواب دیا سات کی سِتًّا فِي الْأَرْضِ وَوَاحِدًا فِي السَّمَاءِ چھ زمین پر ہیں اور ایک آسمان میں۔ قَالَ فَأَيُّهُمْ تَعُدُّ لِرَغْبَتِكَ وَرَهْبَتِكَ؟ قَالَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ اپنی

لہ رواہ الترمذی۔

رغبت اور خوف کے لئے تم نے کس کو چن رکھا ہے، تو انھوں نے جواب دیا آسمان والے کو۔

حدیث شریف کی کتابوں میں مشرکین کا وہ تلبیہ نقل کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں حج و عمرہ کے دوران پڑھا جاتا تھا۔ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ۔ اللہ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوا، آپ کا کوئی شریک نہیں مگر وہ جو آپ کی ملکیت میں ہیں۔ آپ ہی ان کے مالک ہیں اور وہ خود کسی چیز کے مالک نہیں۔

الغرض مشرکین یہ مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کائنات اور اس کی ذات میں کوئی دوسرا شریک نہیں محبت اور خوف کا تعلق بھی اسی خدائے واحد (الٰہ آسمانی) سے رکھتے تھے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات اور اسباب سے بالاتر افعال و اشیاء میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے قریب ہونے کی وجہ سے بتوں کو بھی بعض اختیارات حاصل ہیں جب چاہیں بنا دیں یا بگاڑ کر سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان کو خوش کرنے کے لئے اُن کی پوجا کرتے تھے، عبادت والے اعمال یعنی سجدہ و طواف کرتے اور اپنے بتوں کے نام نذریں اور منتیں مانتے تھے، ان سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے انھی غلط و باطل عقائد اور اعمال نے انھیں گمراہ کر کے جہنم کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔

پھر ان میں بعض اتنے احمق تھے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے بتوں اور مورتیوں سے اپنی حاجتیں طلب کرتے اور ان کو عبادت، محبت اور تعظیم میں اللہ کے برابر قرار دیتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ (الصافات آیت ۹۵) یعنی کیا تم مورتیوں کی پرستش کرتے ہو جن کو تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا ہے۔

بعض مشرک اتنے بے وقوف تو نہیں تھے کہ پتھر کی مورتیوں کی عبادت کرتے لیکن وہ کچھ حقیقی یا فرضی بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک اور

اپنا حاجت روا تسلیم کرتے تھے، عبادت وہ لوگ درحقیقت ان بزرگ ہستیوں کی کرتے تھے لیکن بتوں کو ان کی جلوہ گاہ یا نشانیاں سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (الاعراف آیت ۱۹۴) بے شک وہ جن کو تم پوجتے ہو وہ تمہاری ہی طرح ہمارے بندے ہیں۔

دوسری جگہ فرمان ربانی ہے۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (بنی اسرائیل آیت ۵۷) وہ لوگ جن کو یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب تک (قرب) کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ کون سا راستہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لئے زیادہ نزدیک ہے اور اس کی مہربانی کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

مخلوقِ خدا کی کثیر تعداد اسی طرح سے گمراہ ہو کر تباہ ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص و مقرب بندوں اور مقبول بزرگوں کی مورتیاں بنا کر ان کی عبادت میں لگ گئے، انسانیت کی پوری تاریخ پر اسی مہلک مرض کے بدنما داغ موجود ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک اکثر اقوام عالم اسی طرح گمراہ ہو کر جہنم کا ایندھن بن گئیں، افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب و منتخب بندے جو شرک کی بیخ کنی اور توحید کی اشاعت کے لئے مبعوث ہوتے تھے، جنھوں نے دنیا کو توحید کا درس دیا، توحید کی تبلیغ کے لئے سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کیں، آروں سے چیرے گئے، آگ میں ڈالے گئے لیکن اُف تک نہ کی، اور ہر حال میں اپنا فرض ادا کیا، مخلوق خدا کو شرک سے باز رکھنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے رہے۔ انھی بندگان خدا کو بعد میں آنے والے جاہلوں نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا، حضرات انبیاء علیہم السلام صدیقین، شہداء اور صالحین کے بُت بنا کر ان کی عبادت کرنے لگے۔

شرک فی العبادات پر تفصیلی بحث

عبادت کی حقیقت:۔ اللہ تعالیٰ نے بعض تعظیمی کام اپنے لئے خاص کر کے

مقرر فرماتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، نذر اور منت وغیرہ۔ ایسے اعمال کو عبادات اور قربات کہتے ہیں، عبادت شریعت کی اصطلاح میں کسی ہستی کو غیبی طور پر نفع و نقصان کا مالک اور حاجت روا سمجھ کر اسے راضی اور خوش کرنے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے انتہائی محبت اور تعظیم کے ساتھ اس کے سامنے بے حد و شدید ترین اشد درجہ عاجزی اور انکسار کے اظہار کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے سوا کوئی ایسی ہستی یا چیز نہیں جس کی عبادت شرعاً یا عقلاً درست ہو۔

شرک فی العبادات، شرک کی وہ قسم ہے جس میں انسان زیادہ مبتلا رہے ہیں عام طور پر رکوع و سجدہ، نذر و منت اور قربانی جیسی عبادات میں اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک ٹھہرایا گیا۔

غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے

سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ خالق کون و مکان کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا حرام ہے خواہ وہ عبادت کی نیت سے ہو یا محض تعظیم و تکریم کی نیت سے۔ دونوں صورتیں باجماع امت حرام اور ممنوع ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو عبادت کی نیت سے غیر اللہ کو سجدہ کرے گا وہ تو کافر ہو جائے گا اور جس نے محض تعظیم کے لئے سجدہ کیا اکثر علماء کے نزدیک اسے کافر تو نہیں کہا جائے گا لیکن ارتکاب حرام کا مجرم فاسق کفر اور شرک کے قریب ہوا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے، لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ۔ سجدہ نہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو، اور سجدہ کرو اللہ کو جس نے ان کو بنایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ تھے کہ ایک اونٹ نے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اللہ کے حکم سے بطور معجزہ) سجدہ کیا صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو درخت اور جانور سجدہ کرتے ہیں، ہم تو

زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی (فقط) تعظیم کرو، اگر میں کسی کو اجازت دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے (مشکوٰۃ باب عشرۃ النساء)

اسی طرح قیس بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حیرہ (اطراف کوفہ) کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حیرہ والے اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو زیادہ لائق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری قبر پر تمہارا گزر ہو تو کیا تم میری قبر کو سجدہ کرو گے؟ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا "نہیں"، آپ نے فرمایا:

لَا تَفْعَلُوْا لَوْ كُنْتُ اٰمِرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَآءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ (ابوداؤد) کہ سجدہ نہ کرو، اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کا حق مقرر کیا ہے۔ اسی روایت کو امام احمد نے بھی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ ان احادیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کے سوا کسی اور کے آگے سر رکھنا ممنوع ہے۔ سجدۂ عبادت تو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے کسی بھی شریعت اور امت میں حلال نہیں رہا، البتہ تعظیمی سجدہ قدیم شریعتوں میں جائز تھا لیکن شریعت اسلامی میں غیر خدا کے لئے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بالاتفاق سجدۂ تعظیمی ممنوع اور حرام ہے۔

سجدہ تعظیمی والتحیہ کے بارے میں علماء کی آراء

سجدۂ تعظیمی اور سجدہ تحیہ پر امداد المفتیین میں ایک مفصل بحث ہے جس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

امام ابوبکر جصاص حنفیؒ اپنی کتاب احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ سجدۂ تعظیمی

حضرت آدم علیہ السلام کے لئے بحکم الٰہی جاری کیا گیا تھا اور سب سے پہلے اُن کے لئے مشروع ہوا پھر اُن کی امت میں بھی مشروع رہا ہے اور غالباً یہ سجدۂ تعظیمی کی مشروعیت برابر باقی رہی یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ان کے بھائیوں نے ان کو سجدہ کیا۔ اور اس زمانہ میں سجدہ غایتِ تعظیم کیلئے کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں معانقہ تعظیماً مشروع ہے۔ اسی طرح دست بوسی بھی بعض علماء کے نزدیک بلا کراہت مشروع اور بعض مکروہ فرماتے ہیں مگر سجدہ کو شرع شریف نے کبھی کسی حالت میں کسی ذات کے لئے جائز نہیں کیا۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ اور سجدۂ تعظیمی کی مطلقاً ممانعت احادیثِ صحیحہ اور صریحہ سے قطعی طور سے ثابت ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں

"اگر یہ سجدۂ تعظیم ان چیزوں کو کیا جاوے جن کو سجدہ کرنا خاص کفر کی علامت اور کفار کا شعار ہے جیسے بُت یا پیپل کا درخت یا گنگا جمنا یا چاند سورج وغیرہ تو یہ سجدۂ تعظیم بھی باجماعِ امت اور باتفاقِ علماء کفر و شرک ہے۔ اس کا کرنے والا کافر مرتد ہے۔ اگرچہ اس کا مرتکب نیت عبادت کی نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ شریعت کے احکام ظاہر عمل سے متعلق ہیں نہ نیات سے۔ البتہ ممکن ہے وہ عند اللہ سبحانہ مومن ہو۔ مگر احکام دنیا کے لحاظ سے اس کا مرتکب کافر شمار ہوگا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے۔ علامہ ابن حجر ہیثمی اپنی کتاب الاعلام بقواطع الاسلام میں شرح المواقف سے نقل فرماتے ہیں۔ جو کوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو تسلیم کرے اور اس پر ایمان لائے اور با ایں ہمہ آفتاب کو سجدہ کرے تو وہ بالاجماع مومن نہیں ہے اس لئے کہ شمس کو سجدہ کرنے سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن نہیں اور نہ وہ ایسی حرکت جو بظاہر کفر ہے اختیار نہ کرتا، اور ہمارے ہاں حکم باعتبار ظاہر کے ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے مومن نہ ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہاں اگر ہم کو یہ امر محقق ہو جائے کہ وہ سجدہ عبادت کے خیال سے نہیں کرتا اور اس کا اعتقاد یہ نہیں کہ آفتاب

اس کا رب ہے اور اس کا دل ایمان سے بھرپور ہے تو دیانتہً اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، لیکن قضاءً اس کو کافر کہیں گے۔ اور تمام معاملات اس کے ساتھ وہی کئے جائیں گے جو کفار کے ساتھ کئے جاتے ہیں (نیز کتاب الزواج مصنفہ ابن حجرؒ میں ہے کہ جو شخص کوئی ایسا کام کرے کہ جو سوائے کافر کے کسی دوسرے سے صادر نہیں ہو سکتا تو وہ شخص کافر کہلائے گا (یعنی قضاءً نہ کہ دیانتہً) اگرچہ وہ اعلانیہ اپنے اسلام کو ظاہر کر رہا ہو، جیسے یہودیوں کے کنعہ میں یہود کے ساتھ ان کے طریقے پر زنار وغیرہ پہن کر جانا۔

حاصلِ کلام یہ کہ خدا کے غیر کو سجدہ کرنا عبادت کی نیت و ارادہ سے یا ایسی نیت و کیفیت سے کہ یہ معلوم ہو کہ عبادت کے طور پر سجدہ کر رہا ہے اگرچہ وہ نیتِ عبادت کا منکر ہو تب بھی اس کا مرتکب بالاجماع کافر ہے۔

سجدۂ تعظیم کی دوسری صورت

دوسرا سجدۃ التحیہ وہ ہے جس میں قصد غیر اللہ کی عبادت کا نہ ہو اور سجدہ بھی ان اشیا کی طرف نہ ہو جن کو کفار سجدہ کیا کرتے ہیں، اور جن کی طرف سجدہ کرنا شعار کافروں کا سمجھا جاتا ہے، اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ بھی کفر ہے اور بعض نے اس کا انکار کیا، لیکن اس پر اتفاق ہے کہ یہ حرام قطعی اور گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب قریب بالکفر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ردالمحتار میں امام زیلعیؒ سے منقول ہے، اس سجدہ کی وجہ سے کافر نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کی نیت عبادت کی نہیں بلکہ تعظیم و تحیہ مقصود ہے۔ اور امام شمس الائمۃ السرخسی میں فرماتے ہیں کہ اس سجدہ کی وجہ سے بھی کافر ہو جاوے گا کیونکہ غیر اللہ کو سجدہ بہ نیتِ تعظیم کرنا کفر ہے۔ اور فتاویٰ ظہیریہ میں لکھا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے خواہ کسی نیت و قصد سے ہو انسان کافر ہو جاتا ہے۔ اور فقیہ ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ جو سلطان اور بادشاہ کو سجدہ عبادت کی نیت اور عبادت سمجھ کر کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اسی طرح وہ شخص جس نے سجدہ کیا (خواہ اس وقت کوئی نیت نہ کی ہو (یہ قول جوہر اخلاطی میں منقول ہے)

عالمگیری کتاب الکراہتہ میں لکھا ہے کہ جو بادشاہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم کرے اور زمین کو بادشاہ کے سامنے چومے کافر نہیں ہوتا مگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی قول مفتیٰ بہ ہے۔

جو لوگ کہ سجدۂ غیر اللہ کو مطلقاً کفر کہتے ہیں تو اس میں ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ جیسے سجدہ آفتاب اور بت وغیرہ کو کرنا کفر ہے اسی طرح اپنے آباء و مشائخ کو مخلوقات میں سے اور اولیاء اللہ کے مزارات کو سجدہ کرنا کفر ہے اسی طرح خواہ کسی نیت و ارادہ سے ہو، اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ آباء و مشائخ کے لئے سجدہ کرنا پہلی امتوں کے لئے جائز تھا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں نے سجدہ کیا (تو چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ کفر اور اس کے افعال کی اجازت کبھی کسی مذہب سماوی میں نہیں ہوئی) تو آباء و مشائخ عظام کو سجدہ بطور تعظیم کے کرنا مماثل و مشابہ سجدۂ آفتاب و بت کے نہیں، کیونکہ آفتاب و بت و درخت وغیرہ جن کو سجدہ کرنا کفار کا شعار ہے ان کی تعظیم کا امر اور ثبوت امم اسلامیہ اور ملل حقہ اور ادیان سماویہ میں کہیں بھی نہیں۔

الغرض چونکہ سجدۂ تعظیمی آباء و مشائخ عظام کے لئے ہم سے پہلی شریعتوں میں مشروع تھا، اگرچہ ہماری امت کے لئے حرام قطعی ہو گیا مگر جواز سابق کی بناء پر اس کا فعل کفر ہونا مشتبہ ہو گیا، اور یہ اصول مسلّم ہے کہ اگر کوئی شبہ کسی کے کافر ہونے میں واقع ہو جائے تو اس پر حکم کفر ہونا جاری نہیں کیا جائے گا لہٰذا جو آباء یا مشائخ کو سجدہ تعظیمی کرے اس پر حکم کفر نہیں لگایا جائے گا، اگرچہ وہ شخص کافر ہونے کے قریب ہو جاتا ہے (کتاب الاعلام ص ۳۳ ج ۲)

دین اسلام کی شرک سے حفاظت

جہاں اللہ پاک نے اس امت مرحومہ کو طرح طرح کی نعمتیں اور فضیلتیں عطا فرمائیں اور کنتم خیر امۃٍ فرما کر اس امت کی شان کو دوبالا کیا ہے، اسی طرح اس امت کے ساتھ نہایت رحمت کا معاملہ فرمایا ہے اور اس امت پر ایسے احکام نازل کئے

ہیں جس سے کہ امت کی گمراہی سے مکمل حفاظت ہو، اور جب کسی چیز کو ممنوع کرنا منظور ہوا تو اس شے کے لوازمات اور وہ تمام چیزیں حرام کر دی گئیں جو کہ اس شے تک پہنچنے کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ مثلاً زنا کو حرام کیا تو اس کے ساتھ ہی اس حرام فعل کی طرف دعوت دینے والی اشیاء کو بھی ناجائز قرار دیا۔ بت پرستی حرام کی گئی تو ساتھ ہی جاندار کی تصویر بنانا اور رکھنا یہاں تک کہ دیکھنا بھی ناجائز قرار دیا گیا۔ اور چونکہ آفتاب پرست لوگ سورج کو صبح شام پوجتے تھے لہٰذا سورج کے نکلنے کے وقت فجر کی نماز اور سورج کے ڈوبتے وقت عصر کی نماز کو ممنوع قرار دیا محض اس وجہ سے کہ آئندہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ یہ نمازیں سورج کی تعظیم کے لئے ہیں اور شرک کی برائی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

بلکہ ہماری روشن شریعت میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ الفاظ میں بھی اہل شرک سے ادنیٰ سی مشابہت پیدا نہ ہو تاکہ کبھی عرصہ دراز کے بعد یہ شرک کا سبب نہ بن جائے، اور پہلی امتوں کی طرح یہ امت بھی ہلاک نہ ہو جائے چنانچہ فرمایا کہ غلام اپنے آقا کو "یا رب" کہہ کر نہ پکارے اُدھر آقا کو بھی روک دیا گیا کہ وہ اپنے غلام کو "یا عبدی" کہہ کر آواز نہ دے۔

ان احکام ہی کی برکت سے یہ امت مرحومہ باوجودیکہ اپنی عمر کی چودھویں صدی ختم کر چکی ہے مگر دین میں زیادتی و نقصان اور شرک و کفر میں بفضلہ تعالیٰ ایسی مبتلا نہیں ہوئی جیسے پہلی امتیں، اور اللہ کے وعدے کے مطابق ہمیشہ حفاظت میں رہے گی۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

مکمل حفاظت کی یہ نعمت اس امانت والی امت ہی کے لئے مخصوص ہے پہلی امتوں میں یہ نعمت احکام کے اعتبار سے کمال کی حد تک نہیں تھی، حرام چیزوں کی طرف دعوت دینے والی اشیاء حرام نہ تھیں چنانچہ ان کے لئے تماثیل اور تصاویر کا استعمال مباح تھا، انہوں نے اس میں زیادتی کی اور ہر نامور انسان کی تصویر کی تعظیم اور عبادت کرنے لگے یہاں تک کہ کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے علاوہ

بھی ہزارہا مثالیں اس کی موجود ہیں۔

الغرض اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ تحقیق اور حق سجدۂ تعظیمی کے بارے میں یہ ہے کہ تعظیمی سجدہ فی نفسہٖ کفر وشرک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے پہلی امتوں میں جائز تھا۔ البتہ کفر وشرک کا ذریعہ ضرور ہے اور صورت میں بھی کفر کا فعل ہے اور اسی وجہ سے یہ سجدۂ تعظیمی پہلی امتوں میں اور پہلے زمانے میں شرک کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اور وہ لوگ اس کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہوگئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے اور آخرت میں ہمیشہ کے عذاب کے مستحق ہوتے۔

پس خداوند قدوس کی بے پایاں رحمت اور لطف وکرم کا تقاضا ہوا کہ اس بہترین امت پر انعام کیا جائے اور ہدایت کو ہمیشہ باقی رکھنے اور گمراہی سے نجات کے لئے یہ مناسب ہے کہ کفر وشرک کے ذریعوں کو بھی ناجائز اور ممنوع قرار دیا جائے۔ اگرچہ کسی ذریعہ کا کفر وشرک کے ساتھ دور کا تعلق ہو۔ اسی وجہ سے تعظیمی سجدہ کا جواز منسوخ ہوگیا اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سجدۂ تعظیم کو ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دیا گیا۔

الغرض بیس صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے۔ مَا یَنْبَغِیْ لِبَشَرٍ اَنْ یَّسْجُدَ لِبَشَرٍ وَلَوْ صَلُحَ لِبَشَرٍ اَنْ یَّسْجُدَ لِبَشَرٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِھَا مِنْ عِظَمِ حَقِّہٖ عَلَیْھَا۔[1]

اور جو حدیث دس صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو وہ موافق قول راجح و مختار متواتر ہے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی اعلیٰ درجہ کی متواتر حدیث ہوگئی۔ اگر کوئی اسے متواتر تسلیم نہ کرے تو مشہور ہونے کا منکر نہیں ہوسکتا۔ اور مشہور حدیث سے آیت کریمہ کا نسخ جائز ہے جیسا کہ کتب اصول میں وضاحت کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں اجماع امت بھی ہے کہ سجدۂ تعظیمی حرام ہے اور کسی امام یا مجتہد یا فقیہہ کا زمانۂ سلف اور خلف میں اس بارے میں اختلاف مذکور نہیں بلکہ اجماع تام

---

[1] اس حدیث شریف کے الفاظ اور ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

اس کی حرمت پر ہے۔

سجدہ بیت اللہ

پس اسی اصول کے مطابق بیت اللہ شریف کو بھی سجدہ کرنا کفر ہے۔ در مختار میں ہے لَوْ سَجَدَ لِلْكَعْبَةِ نَفْسِهَا كَفَرَ یعنی اگر کعبہ ہی کو سجدہ کیا تو کافر ہو جائے گا۔

علامہ ابن عابدین المعروف بہ الشامیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔ یعنی اگر سجدہ اللہ کو ہوا اور کعبہ کی طرف منہ ہوا اس کا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور کان السُّجُوْدُ لِنَفْسِ الْكَعْبَةِ كُفْرٌ۔ یعنی اگر کعبہ ہی کو سجدہ کیا تو یہ کفر ہے۔
(شامی جلد اول کتاب الصلوٰۃ)

اب جب کہ بیت اللہ شریف کے لئے سجدہ ناجائز ہے اور محبوب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک قبر کے لئے سجدے کی اجازت نہیں تو کسی اور کی قبر کے لئے تو سجدہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سجدہ یا رکوع تو بہت بڑی بات ہے ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ فِي الزَّاهِدِيْ الْاِيْمَاءُ فِي السَّلَامِ اِلٰى قَرِيْبِ الرُّكُوْعِ كَالسَّجْدَةِ
یعنی سلام کرتے وقت رکوع کے قریب جھک جانا سجدے کی طرح ہے۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ الْاِنْحِنَاءُ لِلسُّلْطَانِ اَوْ لِغَيْرِهٖ مَكْرُوْهٌ لِاَنَّهٗ يُشْبِهُ فِعْلَ الْمَجُوْسِ كَذَا فِيْ جَوَاهِرِ الْاَخْلَاطِيْ وَيُكْرَهُ الْاِنْحِنَاءُ عِنْدَ التَّحِيَّةِ وَبِهٖ وَرَدَ النَّهْيُ كَذَا فِي التُّمُرْتَاشِيْ ص ۳۶۹ ج ۵ یعنی بادشاہ وغیرہ کے لئے بھی جھکنا مکروہ ہے کیونکہ یہ مجوسیوں کے فعل سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ جواہر اخلاطی میں ہے کہ سلام کے وقت جھکنا مکروہ ہے اور اس پر منع وارد ہوئی ہے۔

زیارتِ قبور

بلاشبہ زیارتِ قبور جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ انسان عبرت حاصل کرتا ہے اور آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دل نرم ہو جاتے ہیں۔ لیکن قبر والے ہی سے کوئی چیز طلب کرنا یا قبر کی طرف رخ کر کے نماز

پڑھنا، قبر کو ہاتھ وغیرہ لگا کر اپنے بدن پر ملنا، قبر کو بوسہ دینا اور اس کا طواف کرنا وغیرہ افعال شریعتِ اسلامی میں ناجائز اور ممنوع ہیں۔ علماء حضرات کا فرض ہے کہ حسبِ توفیق عوام کو زیارت کرنے کا صحیح طریقہ بتلائیں، نہ یہ کہ جو کوئی بھی کہیں زیارت کے لئے جائے اس پر کفر و شرک کے فتوے لگائیں۔ البتہ ناسمجھ اور بے علم لوگوں کو بے مہار چھوڑ دینا بھی ظلم ہے کہ جو ان کے جی میں آئے کرنے لگیں اور محض قبروں کو اللہ کے سوا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر سجدے کرنے لگیں اور شرک میں مبتلا ہو جائیں، جیسا کہ مشرکینِ عرب کرتے تھے۔ وہ لوگ بعض ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں لیکن ان کا اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق ہے اور اس کے کارخانہ قدرت میں ایسا عمل و دخل ہے کہ وہ عوام کی تکلیفیں دور کر سکتے ہیں، دولت، عزت، صحت اور اولاد جیسی چیزیں دے سکتے ہیں پس ان کو خوش کرنے کے لئے ان کی عبادت اور پرستش کیا کرتے اور ان سے اپنی حاجتیں پوری کرنے کی درخواستیں کرتے، قرآن پاک نے ان کے اسی عقیدہ کو شرک قرار دیا۔ اللہ نہ کرے کہ ہمارے سادہ لوح عوام ایسے خرافات میں مبتلا ہو جائیں پھر تو مشرکینِ عرب اور ان کے عقیدے میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور نتیجہ دنیا و آخرت کی تباہی اور نقصان کے سوا اور کیا ہوگا؟ اللّٰھم نعوذ بک من ذلک۔

غیر اللہ کے لئے نذر نذر، منت اور قربانی عبادات میں سے ہیں۔ اور اسی لئے خاص اللہ ہی کا حق ہیں۔ اللہ کے سوا کسی کے نام پر نذر یا منت کا ماننا حرام اور ناجائز ہے۔ نہ ہی غیر اللہ کے نام پر ذبح یا قربانی کرنا جائز ہے۔ اس قسم کے سارے افعال مشرکانہ اور باطل ہیں، چنانچہ خلاصۃ الفتاویٰ صفحہ ۳۰۸ جلد ۳ میں ہے۔ اَلنَّذْرُ لِغَیْرِ اللّٰہِ حَرَامٌ لِاَنَّہٗ مِنْ اَنْوَاعِ الْکُفْرِ لِاَنَّ ھٰذَا عِبَادَۃٌ وَالْعِبَادَۃُ لِغَیْرِ اللّٰہِ کُفْرٌ۔ غیر اللہ کے لئے نذر حرام ہے کیونکہ یہ کفر کی ایک قسم ہے، وہ اس طرح کہ نذر ایک عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کفر ہے۔

بحر الرائق اور رد المحتار میں ہے وَ النَّذرُ لِلْمَخلُوقِ لَا یَجُوزُ لِاَنَّہٗ عِبَادَۃٌ وَالْعِبَادَۃُ لَا تَکُونُ لِلْمَخلُوقِ (شامی جلد ۲ کتاب الصوم) یعنی مخلوق کے نام پر نذر ماننا جائز نہیں، کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی۔

غیر اللہ کے نام ذبیحہ

قرآن مجید میں چار مقامات پر غیر خدا کے نام ذبح کو حرام فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحمَ الْخِنْزِیرِ وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیرِ اللّٰہِ ()

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف حرام کیا ہے مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیفہ میں درج تھا لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیرِ اللّٰہِ (رواہ مسلم) اللہ کی لعنت ہو اس پر جو غیر اللہ کی نیت سے جانور ذبح کرے۔

شریعت نے اس بارے میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ جانور کو ضیافت اور مہمان نوازی کے علاوہ صرف کسی حاکم اعلیٰ کے سامنے اس کی تعظیم کے طور پر ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے کو ناجائز بتایا ہے (دیکھئے جامع الرموز ص ۴۷۹) رد المحتار، مجمع الانہر، فتاویٰ بزازیہ، زاہدی اور بحر الرائق وغیرہ میں یہ مسئلہ صاف اور تفصیل سے موجود ہے۔

مہمان کے لئے جانور ذبح کرنے میں کوئی اشکال (یا الجھن) نہیں کیونکہ یہاں صرف مہمان کی عزت اور تکریم مراد ہوتی ہے محض خون بہانا مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح قصاب کا جانور ذبح کرنا گوشت حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے فقط خون بہانا مقصود نہیں ہوتا، جب کہ حاکم اعلیٰ وغیرہ کے لئے خون بہانا اصل مقصد ہوتا ہے اور گوشت کا درجہ دوسرا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی تعظیم کی خاطر اس کے سامنے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔

اب یہ قاعدہ واضح ہو گیا کہ جہاں خون بہانا اصل ہو اور گوشت کا حاصل کرنا دوسرے درجے میں ہو تو وہاں غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا حرام ہے۔ اور اگر گوشت کا

حصول اصل ہو جس کے لئے خون بہانا ضمناً ہو تو یہ جائز اور درست ہے۔

ناجائز یا مشتبہ رسم

اس قاعدہ سے بھی معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں جو رسم و رواج کافی مدت سے چلے آرہے ہیں کہ کسی سے معذرت اور معافی مانگنے یا کسی سے امداد و نصرت طلب کرنے کی خاطر اس کے گھر کوئی جانور بکرا وغیرہ لے جاتے ہیں اور اسے اپنے ہاتھوں اس کی چوکھٹ یا گھر میں ذبح کرتے ہیں تو ایسی مذبوحہ کو اگر حرام نہ بھی کہا جائے کم از کم مشتبہ تو ضرور ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ مجرم اپنے ساتھ بیسیوں شرفا۔ اور دوسرے لوگوں کو جرگہ کے طور پر مظلوم اور مجروح کے گھر لے جاتے ہیں تو ان سب کی مہمانی اور ان کے لئے تکلف کرنے کا بار مظلوم اور مجروح کے سر کیوں تھوپ دیا جائے۔

اس مشکل کا آسان حل یہ ہے کہ مظلوم اور مجروح کو کوئی جانور بکرا وغیرہ ھدیۃً پیش کیا جائے اور مجرم اور جرگہ والے اس کے ذبح کرنے کے تکلف کی بجائے مظلوم فریق کے صوابدید پر چھوڑ دیں، خواہ وہ اس کو اپنے پاس رکھے یا انہی مہمانوں کی تکریم اور ان کو کھلانے کے لئے ذبح کر ڈالے تو ایسی صورت میں ذبیحہ بلا اشتباہ حلال ہو جائیگا

ایصالِ ثواب

اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر اور اللہ ہی کی رضا اور خوشنودی کے لئے تلاوت کرے یا نوافل پڑھے، صدقہ وخیرات یا قربانی کرکے اس کا ثواب اپنے اقرباء۔ اساتذہ یا مشائخ کو بخش دے، یہ جائز ہے، ان کو یہ ثواب پہنچ جاتا ہے۔

نذر

اسی طرح اگر کوئی اللہ کے نام پر نذر مانے مثلاً یوں کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر زید کو اتنی اتنی چیز دوں گا بشرطیکہ زید مسکین ہو تو یہ

ل اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر اتنی رقم یا غلہ وغیرہ فلاں شیخ یا بزرگ یا خانقاہ یا مدرسہ وغیرہ کے فقراء پر تقسیم کروں گا اس کا ثواب فلاں شیخ یا بزرگ کو بخش دوں گا تو یہ بھی جائز ہے۔ البتہ اگر کام پورا ہو جانے کے بعد وہ اس متعین فقراء کے بجائے دوسرے فقراء پر تقسیم کردے تو اس کی نذر پوری ہو گئی اور اس کا ثواب اس شیخ یا بزرگ کو ملے گا۔

نذر بھی جائز ہے، بلکہ اگر جس شے کی نذر مانی گئی ہے وہ اس مخصوص آدمی (زید) کو نہ بھی دیں، دوسرے فقرا۔ کو دے دیں، تو بھی جائز ہے۔ فقہا۔ کے اقوال میں تفصیل واضح طور پر موجود ہے۔

باب دوم

دست بوسی

باب دوم

دست بوسی یعنی ہاتھ چومنا

کسی اللہ والے عالم یا زاہد کے ہاتھ پاؤں چومنے کے بارے میں فقہائے کرام کا کچھ اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے جب کہ بعض کے نزدیک اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہے لیکن بعض برائیوں کو روکنے کی خاطر منع فرماتے ہیں، وہ دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں، ایک تو وہ جسے ابن شیبہ و ابن ماجہ وغیرہ نے نقل کیا ہے دوسری جامع ترمذی کی روایت ہے،

عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلرَّجُلُ مِنَّا يَلْقٰى اَخَاهُ اَوْ صَدِيْقَهٗ اَيَنْحَنِيْ لَهٗ؟ قَالَ لَا، قَالَ اَفَيَلْتَزِمُهٗ وَيُقَبِّلُهٗ؟ قَالَ لَا، قَالَ فَيَاْخُذُ بِيَدِهٖ وَيُصَافِحُهٗ؟ قَالَ نَعَمْ، هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ

(الترمذی ج ۲ ابواب الادب) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملے اور (تعظیماً) جھکے؟ آپ نے فرمایا نہیں (دوبارہ سوال کر کے) کہا کہ اسے گلے لگائے اور بوسہ دے؟ فرمایا نہیں۔ (انھوں نے تیسری بار) کہا: اس کا ہاتھ پکڑے اور مصافحہ کرے؟ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "ہاں"

احادیث و آثار سے جوازِ دست بوسی

لیکن بعض صحیح احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس کا جواز بلکہ بعض اوقات مستحب ہونا بھی ثابت ہے، چند احادیث و آثار کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ترمذی میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے مدینۂ منورہ میں آنے کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، حدیث کے آخر میں وہ فرماتی ہیں کہ فَاعْتَنَقَهٗ

وَقَبَّلَهٗ. یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو گلے لگایا اور چوما۔[1]
(الترمذی ابواب الادب)

(۲) سنن ابی داؤد میں عبد القیس کے وفد کے بارے میں حضرت زارع بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم مدینہ منورہ پہنچے تو ہم اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترے۔ فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَهٗ. اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں مبارک کو بوسہ دیا۔

اسی قصہ کو سنن ابی داؤد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی نقل کیا گیا ہے جس میں ہے کہ فَدَنَوْنَا مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبَّلْنَا يَدَيْهِ یعنی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔
(ابوداؤد کتاب الادب ج ۲)

اسی قصہ کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں حضرت مزیدۃ عبدی اور نافع عبدی رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی نقل کیا ہے (کذا فی مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۹۰)[2]

(۳) طبرانی نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب ان کی معافی کے بارے میں آیت نازل ہوئی تو آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے فَاَخَذَ بِيَدِهٖ فَقَبَّلَهَا. اور آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پکڑا اور اسے چوما (مجمع الزوائد ص ۴۲ ج ۸)

(۴) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ اَنَّهٗ قَبَّلَ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک چومے۔[3]
(مجمع الزوائد ص ۴۲ جلد ۸)

(۵) جمع الفوائد جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ

---

[1] قال الترمذی ہذا حدیث حسن غریب لا نعرفہ من حدیث الزہری الا من ہذا الوجہ۔

[2] قال الہیثمی وفیہ یحیی بن عبد الحمید الحمانی وہو ضعیف۔

[3] قال الہیثمی رواہ ابو یعلی وفیہ یزید بن ابی زیاد وہو لین الحدیث وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح۔

علیہ وسلم کو بوسہ دیا اور موصل کے رہنے والے سے بتایا کہ بڑی نرمی کے ساتھ بوسہ دیا (حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم ج ۲ ص ۵۸۳)

(۶) حضرت ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بڑے خوش مزاج شخص تھے۔ آپؓ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے بات کر رہے تھے اور انہیں ہنسا رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پہلو کو ایک لکڑی سے چھیڑا۔ اس پر اسید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپؐ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدلہ لے لو۔ انہوں نے عرض کیا، کہ آپؐ تو کُرتہ پہنے ہوئے ہیں اور میرے جسم پر کُرتہ نہیں تھا۔ راوی کہتے ہیں فَرَفَعَ عَنْ قَمِيْصِهٖ فَاحْتَضَنَهٗ وَجَعَلَ يُقَبِّلُ كَشْحَهٗ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص مبارک اٹھا دی اور اسید رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے اور آپؐ کے پہلو کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ اور کہا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں میں نے تو بدلہ سے اسی کام کا ارادہ کیا تھا (مستدرک ج ۳ ص ۲۸۸)، اس حدیث کو ابوداؤد نے بھی حضرت اُسید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (دیکھئے ابوداؤد ج ۲ کتاب الادب باب فی قبلۃ الجسد)

(۷) ترمذی ونسائی وغیرہ میں صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو یہودی آئے۔ اور انہوں نے آیات بینات کے بارے میں سوال کیا۔ اسی حدیث میں یہ بھی ہے فَقَبَّلُوْا يَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ وَقَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ نَبِيٌّ کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے نبی ہیں۔ ہذا حدیث حسن صحیح۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اس (یعنی بوسہ دینے) کے باب میں یزید بن اسود، ابن عمر اور کعب بن مالک

لہ قال الحاکم ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ ووافقہ الذہبی فقال صحیح واخرجہ الطبرانی فی الکبیر عن اُسید بن حضیر وشفوکما فی کنز العمال ص ۲۰۱ ج ۷۔

رضی اللہ عنہم سے بھی روایتیں موجود ہیں (الترمذی ابواب الادب)

(۸) سنن ابی داؤد وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث افک کی روایت ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری برأت اور صفائی قرآن مجید میں بھیج دی تو مجھے میرے والدین نے فرمایا کہ قُوْمِیْ فَقَبِّلِیْ رَأْسَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اٹھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کو بوسہ دے۔

(ابوداؤد کتاب الادب جلد ۲)

(۹) حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عمر اور ابن جابر رضی اللہ عنہم سے مرفوعًا ابوداؤد وغیرہ نے شعبیؒ سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب حبشہ سے لوٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ فَالْتَزَمَہٗ وَقَبَّلَ مَا بَیْنَ عَیْنَیْہِ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گلے لگایا اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا (ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب)

(۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا یُقَبِّلُ عُثْمَانَ بْنَ مَظْعُوْنٍ وَھُوَ مَیِّتٌ حَتّٰی رَأَیْتُ الدُّمُوْعَ تَسِیْلُ کہ عثمان بن مظعونؓ کو بوسہ دے رہے تھے جب کہ وہ وفات پا چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو بہ رہے تھے (ابوداؤد کتاب الجنائز ج ۲) اسی قسم کی روایت معاذ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی گئی ہے۔

اور اس حدیث کو امام ترمذیؒ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کر کے فرماتے ہیں۔

وَفِی الْبَابِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَابِرٍ وَعَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ قَالُوْا اِنَّ اَبَا بَکْرٍ قَبَّلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ مَیِّتٌ۔ یعنی ابن عباس، جابر اور عائشہ

لہ قال ابوعیسیٰ الترمذیؒ وفی الباب عن یزید بن الاسود وابن عمر وکعب بن مالک، وفی سنن ابن ماجہ عن صفوان بن عسال ان قومًا من الیہود قبلوا ید النبی صلی اللہ علیہ وسلم ورجلیہ ابن ماجہ کتاب الادب)

لہ وفی مجمع الزوائد عن معاذ ابن ربیعہؓ قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل عثمان بن مظعون رواہ البزار واسنادہ حسن (مجمع الزوائد باب تقبیل المیت ج ۳ ص ۲۰)

رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیا جب کہ وہ رحلت فرما چکے تھے، اور آخر میں فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث حسن صحیح ہے۔

علامہ الہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد میں ایک طویل حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رحلت فرمانے کا واقعہ یزید بن بابنوس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مسند امام حنبل رحمہ اللہ وغیرہ سے نقل کیا ہے جس میں بیان ہے۔

ثُمَّ جَاءَ اَبُوْبَکْرٍ فَرَفَعَ الْحِجَابَ فَنَظَرَ اِلَیْہِ فَقَالَ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَتٰی مِنْ قِبَلِ رَاْسِہٖ فَحَدَرَ فَاہُ فَقَبَّلَ جَبْہَتَہٗ ثُمَّ قَالَ وَانَبِیَّاہُ ثُمَّ رَفَعَ وَحَدَرَ فَاہُ وَقَبَّلَ جَبْہَتَہٗ وَقَالَ وَاصَفِیَّاہُ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَہٗ وَحَدَرَ فَاہُ وَقَبَّلَ جَبْہَتَہٗ وَقَالَ وَاخَلِیْلَاہُ ..... قَالَ الْہَیْثَمِیُّ رَحِمَہُ اللّٰہُ فِیْ رِجَالِ اَحْمَدَ ثِقَاتٌ (مجمع الزوائد ص ۳۱، ۳۲ ج ۹) پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور پردہ اٹھایا۔ آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا اور فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے آکر اپنا منہ جھکایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو چوما پھر کہا ہائے میرے نبی! پھر اپنا سر اٹھایا اور پھر منہ جھکا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دے کر کہا ہائے میرے خالص دوست! پھر (تیسری مرتبہ) سر اٹھایا اور پھر منہ جھکا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور فرمایا ہائے میرے خلیل!۔

یہاں تک تو صرف وہ روایات اور واقعات بیان کر دیئے گئے ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بوسہ دیا یا کسی اور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چوما۔ اب بعض ایسے واقعات اور آثار پیش کئے جاتے ہیں جن میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور دوسرے سلف صالحینؒ نے ایک دوسرے کی دست بوسی کی ہے اور ان کو کسی نے منع نہیں کیا ہے۔

(۱) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ الادب المفرد میں حضرت صہیبؓ سے روایت

کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پیر چومتے تھے (باب تقبیل الرجل)

(۱۲) تمیم بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے، ان کا استقبال حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مصافحہ کیا اور ان کا ہاتھ چوما اس حدیث کے آخر میں ہے کہ حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہاتھ کا چومنا سنت ہے[1]

(۱۳) طبرانیؒ نے یحییٰ بن الحارث الذماریؒ سے روایت کیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے ملا۔ ان سے کہا کہ آپ نے اس ہاتھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے؟ انھوں نے فرمایا۔ ہاں میں نے عرض کیا تو آپ اپنا ہاتھ مجھے دیجئے تاکہ میں اسے بوسہ دوں تو انھوں نے میری درخواست کو منظور کر لیا اور میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا[2] (رواہ الطبرانی)

(۱۴) اور طبرانیؒ نے معجم اوسط میں جید سند سے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے بَایَعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِیْ هٰذِہٖ فَقَبَّلْنَاهَا فَلَمْ یُنْکِرْ ذٰلِکَ یعنی میں نے اسی ہاتھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو ہم دیکھنے والوں نے ان کا یہ ہاتھ چوما اور انھوں (یعنی سلمہ بن اکوعؓ) نے اس (چومنے) کو برا نہ مانا۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط)

(۱۵) حضرت عمار بن ابی عمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک روز سوار ہونے لگے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے (تکریماً) ان کے گھوڑے کی رکاب تھام لی حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے! آپ ہٹ جائیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

---

[1] اخرجہ عبد الرزاق و الخرائطی فی مکارم الاخلاق و البیہقی و ابن عساکر کذا فی کنز العمال ج ۹ ص ۲۳۰ [2] رواہ الطبرانی وفیہ عبد الملک القاری لم اعرفہ و بقیہ رجالہ ثقات کذا فی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۴۲ [3] قال الہیثمیؒ و فی الصحیح منہ البیعۃ رواہ الطبرانی فی الاوسط و رجالہ ثقات (مجمع الزوائد ج ۸ صہ ۴۲)

نے فرمایا ہمیں اپنے علماء اور بڑے لوگوں کے ساتھ اسی طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے
یہ سن کر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذرا مجھے اپنا ہاتھ تو دکھایئے، حضرت ابن
عباس رضی اللہ عنہما نے اپنا ہاتھ نکالا تو حضرت زیدؓ نے اس کو چوم لیا اور کہا کہ ہمیں
اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیتؓ کے ساتھ اسی طرح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[1]

(۱۶) بیہقیؒ وغیرہ نے غزوہ روم کا طویل واقعہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت
کیا ہے اس میں ہے کہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں سمیت لوٹ کر حضرت
عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور جب پوری سرگزشت سنائی تو حضرت عمر
رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔[2]

(۱۷) حضرت سفیان ثوری (رحمہ اللہ تعالیٰ) سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک
مجلس میں بیان کیا کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی سنت ہے، اسی مجلس میں
عبداللہ بن مبارکؒ موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔[3]

مذکورہ بالا روایات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ متقی عالم یا
شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دینا فی نفسہٖ جائز بلکہ بعض اوقات مستحسن ہے اور حضرت
انسؓ کی روایت جس سے ممانعت معلوم ہوتی ہے، اول تو وہ مذکورہ بالا روایات کو
منسوخ نہیں کر سکتی کیونکہ اس حدیث کو ناسخ ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل یا قرینے
کی ضرورت ہے، یہاں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور خلفائے راشدین
(رضی اللہ عنہم اجمعین)، اور تابعینؒ تک سے جواز بلا نکیر ثابت ہے۔ دوسرے یہ کہ
خود اسی حدیث میں ممانعت کا ایک قرینہ موجود ہے وہ یہ کہ سوال ایک عام دوست
یا مسلمان کے بارے میں پوچھا گیا ہے، کسی متقی عالم یا سلطان عادل کے بارے میں
نہیں، پس یہ ممانعت خاص صورت میں ہے اور یہ بات بعید از تاویل اور

---

[1] اخرجہ ابن عساکر کنز العمال ص ۳۹۶ ج ۱۲ [2] اخرجہ البیہقی و ابن عساکر کذا فی کنز العمال ج ۷ ص ۶۱
وحیاۃ الصحابہ ج ۲ ص ۳۱۹ [3] فی تبیین الحقائق للعلامہ عثمان بن علی الزیلعی، وقال سفیان الثوریؒ تقبیل ید العالم و
ید السلطان العادل سنۃ فقام عبداللہ بن مبارک فقبل راسہ (تبیین الحقائق ص ۲۵ ج ۶ کتاب الکراہیۃ)

محض قیاس آرائی نہیں۔

چومنے کے اسباب و محرکات

کیونکہ بوسہ دینے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔

(۱) نفسانی شہوت سے چہرہ وغیرہ چومنا جو کہ اپنی بیوی یا مملوکہ کنیز کے علاوہ کسی اور کے سارے فقہائے امت کے نزدیک ممنوع اور ناجائز ہے۔

(۲) بزرگانہ شفقت کی وجہ سے مثلاً والدین اپنے بچوں کو چومتے ہیں یا کوئی اپنے چھوٹے بھائی وغیرہ کو پیشانی پر بوسہ دیتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بدن کو بوسہ دینا اور اسی طرح زید بن حارثہؓ اور جعفرؓ بن ابی طالب کی پیشانی کو بوسہ دینا ثابت ہے۔ یہ بھی بلا اختلاف جائز ہے۔

(۳) تعظیم و تکریم کے لئے علماء و مشائخ کے ہاتھ یا پیشانی کو چومنا بسبب ان کے دینی شرف کے اس کا جواز تو مذکورہ بالا روایات سے ثابت ہی ہے۔

(۴) حصول دنیا کے لئے مثلاً کسی مالدار آدمی یا صاحب اقتدار کے ہاتھوں کو چومنا یا محض رسماً ایک دوسرے کے ہاتھ اور پیشانی کو بوسہ دینا۔ یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۵) حکم شریعت کی وجہ سے مثلاً حجر اسود کو بوسہ دینا جو بالاتفاق جائز اور مسنون ہے۔

یہ اسباب سمجھ لینے کے بعد یہ بات بآسانی واضح ہو جاتی ہے کہ منع والی حدیث کو صرف پہلی اور چوتھی قسم پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ خود منع والی حدیث کے راوی حضرت انسؓ کے بارے میں امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابن جدعان رضی اللہ عنہ نے انسؓ سے پوچھا کیا تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ سے چھوا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، تو آپؓ نے انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا (الادب المفرد باب تقبیل الید ص ۴) اب تو کوئی شک نہیں رہتا کہ ممانعت فقط مذکورہ دو صورتوں کے ساتھ خاص ہے، ورنہ انس رضی اللہ عنہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو کبھی دست بوسی کی اجازت نہ دیتے۔ پس منع اور جواز، دونوں اقسام کی احادیث میں موافقت اور تطبیق ہو سکتی ہے اور کوئی تضاد یا تعارض باقی نہیں رہتا۔

فقہاء کا مسلک اسی تاویل کی بناء پر فقہاء اور علماء کرام نے مشائخ و علماء کی دست بوسی کو جائز اور مستحسن قرار دیا ہے چنانچہ علامہ ابوبکر بن المسعود الکاسانیؒ (المتوفی ۵۸۷ھ) بدائع الصنائع صفحہ ۱۲۴ جلد ۵ کتاب الاستحسان اس مسئلے کے بارے میں (مختصراً) یوں لکھتے ہیں۔

چومنے اور گلے لگانے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ کسی مرد کے لئے دوسرے مرد کے منہ ہاتھ یا کسی اور عضو کو چومنا یا اس سے معانقہ کرنا مکروہ ہے، جب کہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک کوئی مضائقہ نہیں اور دلیل میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ والی روایت پیش کرتے ہیں کہ جب وہ حبشہ سے واپس ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں گلے لگایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل کم از کم حلال و مباح ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ روایت کیا گیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سفر سے واپس آتے تو ایک دوسرے کو بوسہ دیتے اور گلے لگاتے تھے۔ اس کے برعکس ابوحنیفہؒ اور محمدؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا آپس میں ایک دوسرے کو چوما کریں، فرمایا نہیں، پوچھا گیا کہ ایک دوسرے سے معانقہ کیا کریں کہا نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ کیا آپس میں مصافحہ کیا کریں، تو فرمایا، ہاں۔

شیخ ابومنصور (ماتریدیؒ) نے فرمایا کہ معانقہ اس صورت میں مکروہ ہے جبکہ ایسے طرز پر ہو جو شہوت کے ساتھ عریانی کی حالت میں کیا جاتا ہے، لیکن جب اس سے (محض) اکرام اور احسان مقصود ہو تو مکروہ نہیں۔ اور یہی حکم بوسہ دینے کا ہے۔ جو بوسہ، شہوت کے بوسہ کی مانند ہو وہ تو ممنوع ہے ورنہ مباح (جائز) ہے اور ابو یوسفؒ نے جس حدیث سے جواز کا قول اختیار کیا وہ اسی صورت پر محمول ہے (کہ اس میں شہوت کا خطرہ یا مشابہت نہ ہو)

(۲) بحرالرائق میں بحوالہ نوادر لکھا ہے کہ عالم اور سلطان عادل کی دست بوسی میں مضائقہ نہیں۔ جیسے کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ عالم

اور سلطان عادل کے ہاتھ کو بوسہ دینا سنت ہے (بحر الرائق ج ۶ ص ۱۹۴)

(۳) فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ ایک مرد کو دوسرے مرد کے منہ پر بوسہ دینا یا اس کے ہاتھ یا بدن کے کسی حصہ کو چومنا ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کے قول کے مطابق مکروہ ہے۔ اور ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ بوسہ دینے اور معانقہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور جب قمیص اور جبہ کے اوپر سے (معانقہ) ہو اور بطور احسان و اکرام کے بوسہ ہو، جو شہوت نہ ہو تو سب کے نزدیک جائز ہے۔

(۴) اور در مختار میں ہے وَفِی الْحَقَائِقِ لَوِ الْقُبْلَۃُ عَلٰی وَجْہِ الْمَبَرَّۃِ جَازَ بِالْاِجْمَاعِ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ص ۲۴۴ ج ۵) یعنی حقائق میں ہے اگر بوسہ دینا بطور احسان و اکرام کے ہو تو بالاجماع جائز ہے۔

(۵) علامہ شامیؒ فرماتے ہیں، قَدَّمَ مِنَ الْخَانِیَۃِ وَالْحَقَائِقِ اَنَّ التَّقْبِیْلَ عَلٰی سَبِیْلِ الْبِرِّ بِلَا شَہْوَۃٍ جَائِزٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ یعنی خانیہ اور حقائق کی روایت سے پہلے گزر چکا ہے کہ بوسہ دینا بطور احسان بغیر شہوت کے بالاجماع جائز ہے۔

(۶) حضرت شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فتح الباری میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، دست بوسی میں فقہائے کرام مختلف ہو گئے ہیں، امام مالک نے اس کے جواز سے انکار کیا ہے اور ان روایات سے بھی جو اس میں آئی ہیں جب کہ دوسرے فقہا حضرات نے اس کی اجازت دی ہے، اور انہوں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال کیا ہے، جس وقت وہ لوگ جہاد سے واپس ہوتے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ، ہم فرار ہونے والے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ایسا نہیں) بلکہ تم حملہ پر حملہ کرنے والے ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں مسلمانوں کی جماعت

لے وفی الدر المختار ولا باس بتقبیل ید الرجل العالم والمتورع علی سبیل التبرک ونقل المصنف عن الجامع انہ لا باس بتقبیل ید الحاکم المتدین والسلطان العادل وقیل سنۃ مجتبیٰ وتقبیل راسہ ای العالم اجود کما فی البزازیۃ ولا رخصۃ فیہ ای فی تقبیل الید لغیرہما ای لغیر عالم وعادل، ہو المختار مجتبیٰ وفی المحیط ان لتعظیم اسلامہ و اکرامہ جاز وان لنیل الدنیا کرہ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ص ۲۴۵ ج ۵)

ہوں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔

دست بوسی کے جواز پر چند احادیث نقل کر کے آگے فرماتے ہیں کہ الابہریؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے جو بوسہ کو مکروہ قرار دیا ہے یہ اس وقت ہے جب کہ تکبر اور بڑائی کی وجہ سے ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لئے ہو یا اس شخص کے علم یا شرافت کی وجہ سے ہو تو یہ جائز ہے۔ آخر میں امام محی الدین نووی رحمہ اللہ کے قول پر ختم کر کے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کسی کی دست بوسی اس کے زہد، صلاح یا علم یا شرافت یا صیانت (یعنی خود کو گناہوں سے بچانا، متقی ہونا) یا اسی طرح اور کسی دینی بات کی وجہ سے ہو تو مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے اور اگر (دست بوسی) اس کی مالداری اور اہل دنیا کے ہاں اس کی شان وشوکت اور مرتبہ مقام کی وجہ سے ہو تو یہ شدید ترین مکروہ ہے اور ابو سعید متولیؒ فرماتے ہیں کہ جائز نہیں۔

اور دُرِّ مختار میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دست بوسی تعظیم اور شرف اسلام اور اکرام کی وجہ سے ہو تو جائز۔ اور اگر دنیا کے حصول کے لئے ہو تو مکروہ ہے (دیکھئے الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار صفحہ ۲۴۵ جلد ۵)

(۲) علامہ عینی (رحمہ اللہ تعالیٰ) نے تقبیل کے مسئلہ پر بہت مختصر اور جامع بیان کر کے آخر میں فرمایا ہے۔ "لیکن یہ سب کچھ جواز اس وقت ہے جب کہ (دست بوسی وغیرہ) بطور احسان اور اکرام کے ہو۔ اور جب یہ (دست بوسی وغیرہ) شہوت کی وجہ سے ہو تو میاں بیوی کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے بوسہ دینے اور معانقہ میں ابو حنیفہ اور محمد رحمہما اللہ کا جو اختلاف منقول ہے وہ اسی صورت میں ہے جب کہ یہ افعال ایسے طریقے پر ہوں جس میں شہوت کا خطرہ اور اشتباہ پایا جائے۔ اور جہاں یہ صورت نہ ہو اور نہ ہی حصول دنیا یا محض رسم مقصود ہو، تو سب کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔

بوسہ کی دو صورتیں ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی از خود کسی کے ہاتھ وغیرہ کو چوم لے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص زید سے مطالبہ کرے کہ آپ ہاتھ یا پاؤں مجھے چومنے کے لئے دیں، کیا زید کے لئے جائز ہے کہ وہ ہاتھ یا پاؤں پھیلا کر لوگوں کو اس کا موقع دے؟ ایسی حالت میں بعض فقہائے کرام منع فرماتے ہیں کہ زید ہاتھ پاؤں پھیلائے کیونکہ یہ صورت ایک متکبرانہ فعل ہے جس سے تکبر پیدا ہو جانے کا احتمال غالب ہے، اگرچہ حقیقۃً اس میں تکبر اور عُجُب نہ بھی ہو۔ پس بعض نے تو زید کے لئے ہاتھ پاؤں پھیلانے کو مکروہ قرار دیا ہے[1] اور بعض نے اصل فعل کے جواز پر نظر کر کے اس کو جائز فرمایا ہے البتہ از خود زید کے ہاتھ پاؤں چومنا بلا اختلاف جائز ہے۔

ایک شبہ یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ دست بوسی وغیرہ اگر جائز بھی ہو جائے تو اگر اس کے لئے جھکنے کی صورت پیش آئے تو وہ انحنا۔ یعنی جھکنے کی وجہ سے بھی مکروہ ہو جائے گا، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہاں جھکنا چومنے کے لئے ہوگا، جھکنا خود مقصود نہیں، جیسے کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جائے اور کوئی جھک کر اُسے اُٹھا لے۔ اس جھکنے میں کسی کو بھی کلام نہیں، حالانکہ یہ جھکنا رکوع سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس میں جھکنا مقصود نہیں بلکہ چیز اٹھانا مقصود ہے۔

زمین بوسی فقہ کی کتابوں میں ایسے دو مسئلے اور بھی ہیں جن کی وضاحت مناسب ہے تاکہ مختلف مسائل آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔

---

[1] فی الہندیۃ: طلب من عالم او زاہد ان یدفع الیہ قدمہ لیقبلہ لا یرخص فیہ ولا یجیبہ الی ذٰلک عند البعض وذکر بعضھم یجیب الی ذالک۔ وفی رد المحتار تحت قولہ اجابہ لما اخرجہ الحاکم ان رجلاً اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ اَرنی شیئاً ازداد بہ یقیناً فقال اذھب الی تلک الشجرۃ فادعھا فذھب الیھا فقال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدعوک فجاءت حتی سلمت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال لھا ارجعی فرجعت ثم اذن لہ فقبل راسہ ورجلیہ وقال لو کنت آمر احدا ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا وقال صحیح الاسناد۔ من رسالۃ الشرنبلالی رد المحتار ص ۲۴۵ ج ۵ ۱۵

(۱) ایک یہ کہ کوئی شخص دوسرے آدمی سے مصافحہ کرنے کے بعد خود اپنے ہی ہاتھ کو چوم لے۔ اس فعل کو فقہائے کرام نے مکروہ اور ناجائز قرار دیا ہے۔

(۲) کسی عالم یا بزرگ کے سامنے زمین کو بوسہ دینا۔ فقہائے کرام اس کو حرام اور ممنوع فرماتے ہیں، ایسے کام کرنے والا اور اس پر راضی ہونے والا دونوں سخت مجرم اور گنہگار ہیں، کیونکہ یہ کام بتوں کے پوجنے اور عبادت کرنے سے مشابہت رکھتا ہے۔[له]

خلاصہ یہ کہ (۱) اگر ہاتھ وغیرہ کو بوسہ دینا شہوت وغیرہ کے ساتھ ہو یا کسی جانب میں شہوت پیدا ہو جانے کا خطرہ یا اشتباہ ہو تو بالاتفاق اپنی بیوی یا زرخرید کنیز کے سوا کسی کے ساتھ جائز نہیں۔

(۲) چھوٹوں پر شفقت و رحم یا متقی علماء اور بزرگوں کے اکرام اور تعظیم کے لئے بوسہ بالاتفاق جائز اور ثابت ہے بشرطیکہ جس کی دست بوسی کی جائے اس کو اس عمل سے تکلیف نہ ہو، اور نہ ہی اس کے نفس میں تکبر و عجب پیدا ہوتا ہو۔ ایسی حالت میں دوسری جانب کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو دست بوسی کا موقع دے۔

(۳) دنیاوی اقتدار اور حصولِ عزت کے لئے کسی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ چومنا ناجائز و ممنوع ہے

(۴) محض رسم اور عادت کے طور پر بھی درست نہیں اور نہ اس میں حد سے تجاوز کرنا چاہیئے کہ ہر وقت گلے ملنے لگیں یا بوسے دینے لگیں بلکہ کسی کے سفر سے واپسی یا رخصت کے موقع پر یا عرصۂ دراز کے بعد ملاقات وغیرہ پر اللہ تعالیٰ و تبارک کی محبت کے غلبہ کی وجہ سے اور سادگی اور بغیر پابندی و بغیر تکلف کے علماء اور بزرگوں کے ہاتھ یا پیشانی کو بوسہ دینا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

له وما يفعله الجهال من تقبيل يد نفسه اذا لقي الغير فهو مكروه فلا رخصة فيه وما يفعلون من تقبيل الارض بين يدي العلماء فحرام والفاعل والراضي به آثمان لانه يشبه عبادة الوثن (تبيين الحقائق ص ۲۵ ج ۶ كتاب الكراهية كذا في البحر الرائق والفتاوى الهندية والدر المختار وغيرها) ص ۲۷۱ ج ۵

باب سوم

قیامِ تکریمی و تعظیمی

باب سوم

قیام

قیام کی قسمیں کسی آدمی کے لئے کھڑا ہو جانے کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) اول:۔ کوئی سفر سے آنے والے کے استقبال کے لئے کھڑا ہو۔

یا آنے والے کو کسی چیز کی بشارت یا خوشخبری دینے کے لئے کھڑا ہو۔

یا پھر کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کی غرض سے۔

یا جگہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھڑا ہونا۔

محبت کی وجہ سے (ایسے شخص کے لئے جس کے ساتھ محبت جائز ہو) مثلاً مسلمان بھائی۔

اور کسی کی مدد، اعانت یا خدمت کی نیت سے کھڑا ہونا مثلاً مریض کو سواری سے اتارنا چڑھانا یا تھامنا وغیرہ

قیام کی یہ سب صورتیں بالاجماع جائز ہیں، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۲) قیام کی دوسری قسم:۔ کسی کے آگے ایسے طریقے سے کھڑا ہونا جیسے عجمیوں کا دستور تھا کہ کوئی بڑا آدمی بیٹھا ہوتا اور اس کے سامنے یا ارد گرد باقی لوگ کھڑے رہتے

قیام کی یہ صورت بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۳) تیسری قسم:۔ کوئی شخص دل میں یہ چاہت اور خواہش رکھے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہو جایا کریں، اس کے بارے میں شدید وعید آئی ہے اور باتفاقِ امت یہ خواہش اور آرزو ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۴) چوتھی قسم:۔ کسی آدمی کے لئے صرف تعظیم و تکریم کے طور پر کھڑا ہو جانا، اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے لیکن یہ کوئی کفر و شرک جیسا شدید اختلاف نہیں بلاشبہ

نماز میں کھڑا ہونا عبادت ہے لیکن ہر قسم کا قیام عبادت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی قُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ "کھڑے رہو اللہ کے سامنے" کے تحت لایا جا سکتا ہے اس لئے کہ نماز کی تمام حرکات و سکنات عبادت ہیں، اگر یہ ساری حرکات نماز سے باہر بھی مطلقاً عبادت یا عبادت کے مشابہ سمجھی جائیں تو اس طرح کسی کے سامنے دو زانو ہو کر التحیات کی صورت میں بیٹھنا بھی ناجائز ہوگا، حالانکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو زانو ہو کر باادب بیٹھے[1]۔

علماء اور مشائخ وغیرہ کے سامنے دو زانو باادب بیٹھنا کسی کے ہاں بھی ناجائز نہیں، بالاجماع امت جائز بلکہ مستحب ہے۔

اسی طرح کسی کے سامنے مطلقاً قیام بھی ممنوع نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے بہت سی صورتوں میں کسی کے لئے کھڑا ہونا بالاتفاق جائز بلکہ بعض اوقات مستحب ہے، مسلمان بھائی اور مہمان کے اکرام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے[2]، اسی طرح اپنے بڑوں، علماء اور مشائخ کی توقیر اور تعظیم کا حکم بھی ہے[3]۔

احترام کا طریقہ

اب ہم کسی کا احترام اور تعظیم کیسے کریں؟ احترام کے حدود کیا ہیں؟ شریعت اسلام نے ہمیں ان کے واضح جوابات دیئے، بعض جگہ روایات کے ظاہری تعارض اور دلائل کی بنا پر علماء میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے اس قسم کے اختلافات کے لئے بھی فقہا کے ہاں حدود متعین ہوتے ہیں بعض کے

---

[1] فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ ووضع کفیہ علی فخذیہ...... الی آخر الحدیث (رواہ البخاری و مسلم وغیرہما)

[2] وعن ابن مسعودؓ قال اذا اکرم الرجل اخاہ فانما یکرم ربہ (مجمع الزوائد ص ۱۶ ج ۸) عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیتق اللہ ولیکرم جارہٗ وفی روایۃ من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ ثلاث مرات (رواہ احمد مجمع الزوائد)

[3] عن عبادۃ بن الصامتؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس من امتی من لم یجل کبیرنا، الحدیث۔ وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ یرفعہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس منا من لم یوقر الکبیر، الحدیث رواہ احمد (مجمع الزوائد ص ۱۴ ج ۸)

ہاں کوئی چیز سنت یا مستحب ہوتی ہے جب کہ دوسروں کے نزدیک وہ واجب یا اس کے برعکس مکروہ وغیرہ ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ فقہائے کرام کے متعلقہ حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے اختلافات کو اپنے حدود کے اندر رہنے دیں۔

الغرض قیام کی چوتھی قسم کے بارے میں علماء کا اختلاف صرف جائز اور مکروہ کی حد تک ہے۔ اور جو لوگ اسے مکروہ فرماتے ہیں وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لَمْ یَکُنْ شَخْصٌ اَحَبَّ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَکَانُوْا اِذَا رَاَوْہُ لَمْ یَقُوْمُوْا لِمَا یَعْلَمُوْنَ مِنْ کَرَاھِیَتِہٖ لِذٰلِکَ۔ ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ غَرِیْبٌ۔ ترمذی ابواب الادب۔ یعنی صحابہ کرام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی بھی محبوب نہ تھا اس کے باوجود جب صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کو دیکھتے تو آپ کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پسند نہیں۔

(۲) ابو مجلز رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نکلے تو حضرت عبد اللہ بن زبیر اور ابن صفوان رضی اللہ عنہم ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ فَقَالَ اِجْلِسَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّتَمَثَّلَ لَہُ الرِّجَالُ قِیَامًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (وَفِی الْبَابِ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ وَھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ (الترمذی ابواب الادب) پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ اس کے سامنے (تعظیماً) کھڑے ہوں، پس وہ اپنا گھر جہنم میں بنا لے۔

حضرت امام ترمذی اور دیگر حضرات فقہائے ان احادیث سے قیام کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔

اب جو حضرات جواز کے قائل ہیں وہ پہلی حدیث کے جواب میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کا کھڑا ہونا بے تکلفی، شدید محبت و تعلق اور تواضع

کی بنا پر ناپسند تھا۔ اس کے جواب میں قیام سے منع کرنے والے حضرات فرماتے ہیں کہ بے تکلفی کا مطلب یہ نہیں کہ اکرام بھی نہ کیا جاتے (اب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بظاہر اکرام کرنے سے کون سی چیز مانع تھی؟) اور قیام کو جائز سمجھنے والے جواب یوں دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کراہیت طبعی کراہیت تھی نہ کہ شرعی کراہیت، جس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا کہ سب سے آگے چلیں، حالانکہ آگے چلنا کسی کے نزدیک ناجائز نہیں ہے، تو یہاں بھی کراہت طبعی مراد ہے، نہ یہ کہ شرعاً مکروہ ہے۔

دوسری حدیث کے جواب میں قیام کے موافقین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تو قیام کی خواہش کرنا ممنوع ہے یعنی اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کے لئے کھڑے ہوں اور اس خواہش کی وجہ عجب و تکبر ہے۔ پس یہ خواہش تو بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے (جیسا کہ تیسری قسم کے بیان میں گزر چکا)

لیکن اس پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ ایک فقیہ صحابی ہیں انہوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک سے ممانعت ہی مراد لی ہے اسی لئے تو انہوں نے منع فرمایا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ اُنؓ کے تواضع اور تقوے کی وجہ سے تھا۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں وہ اس حدیث کی وعید میں نہ آجائیں، کیونکہ وعید اسی کے لئے ہے جس کے لئے قیام کیا جاتا ہے، کھڑے ہونے والوں کے لئے تو نہیں ہے، لیکن اس پر یہ شبہ کیا گیا کہ لوگوں کا کھڑا ہونا سبب بن جاتا ہے خواہش قیام کا، تو جس طرح خواہش قیام ممنوع ہے اسی طرح اس کا سبب بھی ممنوع ہے لیکن یہ شبہ درست نہیں، کیونکہ یہاں قیام کی خواہش ممنوع ہے چاہے لوگ از خود کھڑے ہوں یا نہ ہوں، اب اگر لوگ کسی آدمی کے لئے کھڑے نہ ہوں لیکن اس کی خواہش ہو کہ لوگ کھڑے ہوں تو یہ شخص اس وعید کے تحت آئے گا۔

بہر حال وعید صرف خواہش قیام پر وارد ہوتی ہے جس کی غرض لوگوں میں اپنے مرتبے کو دیکھنا ہے جو کہ تفخر اور تکبر ہے۔

(۳) اخرج عن رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مُتَّکِئًا عَلٰی عَصًا فَقُمْنَا لَهٗ فَقَالَ

أو تقوموا كما يقوم الأعاجم يعظم بعضها بعضاً (ابوداؤد کتاب الادب ۲۷) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصا پر ٹیک لگاتے ہوئے باہر تشریف لائے تو ہم ان کے لئے کھڑے ہوگئے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس طرح مت کھڑے ہو جس طرح کہ عجمی لوگ بعض کچھ (دوسروں) کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۴) حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ (اللہ ان پر رحم کرے) نے فرمایا کھڑے ہو جاؤ تاکہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس منافق کے بارے میں استغاثہ دائر کریں۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقام لی انما یقام للہ تبارک وتعالیٰ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی اور کے لئے نہیں کھڑا ہونا چاہیے صرف اللہ کے لئے کھڑا ہونا چاہیے۔[۱]

بلاشبہ یہ دونوں حدیثیں کھڑا ہونے کو واضح طور پر منع کرتی ہیں لیکن حدیث نمبر ۳ سے قیام کو ناجائز سمجھنے والے صرف وہ قیام مراد لیتے ہیں جو عجمیوں کا دستور تھا مثلاً ترکوں وغیرہ اقوام عجم کی یہ عادت تاریخ سے معلوم ہے کہ ایک (بڑا) آدمی بیٹھا رہتا اور اس کے سامنے دوسرے کھڑے رہتے۔[۲] اسی طرح طبرانی نے اوسط میں انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک ضعیف حدیث بھی نقل کی ہے۔ انما ھلک من کان قبلکم بانھم عظموا ملوکھم بان قاموا وھم قعود[۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) رواہ احمد وفیہ راو لم یسم وابن لہیعۃ وثقہ احمد وغیرہ وضعفہ یحیی القطان وغیرہ، وھو حسن الحدیث علی ما فی شذرات الذہب لابن العماد وقد ترجم لہ فی نحو صفحۃ (مجمع الزوائد ص ۴۰ ج ۸)۔

(۲) چنانچہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں، والثالث ان یکون المقتدی جالس والناس قائمین فھذا طریق الاعاجم۔ یعنی تیسرا یہ ہے کہ مقتدیٰ آدمی بیٹھا ہو اور لوگ اس کے سامنے یا ارد گرد کھڑے ہوں یہی دستور عجمیوں کا ہے (عرف الشذی علی سنن الترمذی کتاب ابواب الادب)

(۳) رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ الحسن بن قتیبہ وھو متروک۔

نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اس طرح تباہ ہو گئیں کہ وہ اپنے بادشاہوں کی تعظیم کرتے تھے اس طرح کہ وہ تو کھڑے رہتے اور بادشاہ بیٹھے رہتے، اسی مسلم کی ایک صحیح حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ بیماری میں بوجہ عذر بیٹھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز میں مشغول تھے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا اِنْ کِدْتُمْ اٰنِفًا لَتَفْعَلُوْنَ فِعْلَ فَارِسَ وَالرُّوْمِ یَقُوْمُوْنَ عَلٰی مُلُوْکِہِمْ وَهُمْ قُعُوْدٌ الحدیث مسلم کتاب الصلوٰۃ ج ۱ ص ۱۷۷ کہ تم عنقریب فارس و روم کے لوگوں کا فعل کرو گے، کھڑے ہوتے ہیں (اردگرد) اپنے بادشاہوں کے اور وہ (بادشاہ) بیٹھے ہوتے ہیں۔

ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ممنوع وہ قیام ہے جو عجمیوں کا دستور ہے کہ کوئی شریف تو بیٹھا رہے اور عام لوگ اس کے اردگرد تعظیم کے لئے کھڑے ہوں۔

قیام کے مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہؓ کا کھڑا ہونا عجمیوں کی طرح تو نہیں تھا بلکہ وہ محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم کے لئے کھڑے ہوتے تھے (اور پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود ان کے اخلاص کے، انھیں کو گویا منع فرما دیا۔

اس کے جواب میں قیام کو جائز کہنے والے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو عجمیوں کی طرح کھڑے ہونے کی خبر دے رہے تھے اور صرف اسی طریقے سے منع فرما رہے تھے (یعنی ان کی نقل سے منع کر رہے تھے ورنہ ادب و عزت سے کھڑا ہونا جائز ہے کیونکہ اس کی وجہ صرف خلوص و محبت ہے)

باقی رہ گئی حدیث نمبر ۴، اس کے بارے میں قیام کو جائز سمجھنے والے جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث بہت کمزور ہے، اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے پھر بھی یہ عجمیوں کے قیام پر محمول ہے کیونکہ قیام کی وہ صورتیں جو قسم نمبر ۱ کے ذیل میں بیان

ہو چکی ہیں بالاتفاق جائز ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قیام ممانعت صرف اسی قیام کی ہے جو عجمیوں کی رسم ہے جس کی طرف متعدد احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ قیام بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے۔

اب جو علماء حضرات قیام کے جواز کے قائل ہیں وہ مندرجہ ذیل احادیث کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔

حدیث نمبر ۵:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو اور نشست و برخاست میں اتنا زیادہ مشابہت رکھتا ہو جتنا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رکھتی تھی۔ اِذَا دَخَلَتْ عَلَیْهِ قَامَ اِلَیْهَا فَاَخَذَ بِیَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَ اَجْلَسَهَا فِیْ مَجْلِسِهٖ، وَکَانَ اِذَا دَخَلَ عَلَیْهَا قَامَتْ اِلَیْهِ فَاَخَذَتْ بِیَدِهٖ وَ اَجْلَسَتْهُ فِیْ مَجْلِسِهَا (ابوداؤد کتاب الادب ج۲)

یعنی جس وقت فاطمہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے کھڑے ہو جاتے، اس کا ہاتھ پکڑتے اور بوسہ دیتے اور اپنے بیٹھنے کی جگہ پر اسے بٹھا دیتے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے تو وہ آپ کی طرف کھڑی ہو جاتی، آپؐ کا ہاتھ مبارک پکڑتی اس کو بوسہ دیتی اور آپ ﷺ کو اپنی جگہ پر بٹھا دیتی۔

قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ یہ قیام دونوں جانب سے قیام محبت اور قیام استقبال ہے جو بالاتفاق جائز ہے، لیکن قیام کو جائز سمجھنے والے اس جواب کو رد کرکے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تو قیام محبت ہو سکتا ہے لیکن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قیام تو تعظیم و تکریم ہی کے لئے ہو سکتا ہے لیکن اس بات پر شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قیام بھی قیام محبت و استقبال مان لیا جائے تو یہ بعید از قیاس بات نہیں، اگرچہ اس میں تعظیم و تکریم کا قوی احتمال موجود ہے۔

قیام کے قائل حضرات زید بن حارثہ، عکرمہ بن ابی جہل، عدی بن حاتم، اسامہ بن شریک اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ کی روایات و واقعات سے بھی استدلال کرتے ہیں

جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۶) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب مدینہ آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر معانقہ کیا اور پیشانی پر بوسہ دیا (رواہ الترمذی ج ۲ ابواب الادب)

(۷) اور جب عکرمہ رضی اللہ عنہ یمن سے واپس ہو کر مدینہ منورہ آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے کھڑے ہوتے گلے لگایا (رواہ الطبرانی)

(۸) عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے یا حرکت فرماتے[۱]۔

(۹) اور حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھڑے ہوتے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک کو بوسہ دیا[۲]۔

(۱۰) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اٹھے اور ان کے دستِ مبارک کو چوما[۳]۔

(۱۱) اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ جب قبول ہوئی، اسی قصہ میں آیا ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھ کر دوڑے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصافحہ کیا اور انہیں مبارک باد دی[۴]۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے واقعات اور روایتیں احادیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، لیکن قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام سفر سے آنے کی خوشی کی وجہ سے تھا اور عدی و عکرمہ رضی اللہ عنہم

---

۱ مجمع الزوائد ص ۳۸۵ ج ۹ ۲ مشکل الآثار ص ۳۷ ج ۲۔

۳ فتح الباری ص ۴۵ ج ۱۱ "وقال سندہ قوی"

۴ فتح الباری ج ۱۱ ص ۴۵۔

۵ مشکل الآثار ص ۳۷ ج ۲۔

اپنے اپنے علاقہ کے رئیس تھے[1]، اور آپ نے تالیف قلب کے لئے قیام فرمایا اور ان کی مدارات کی تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں یا پھر اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آثار سے ان کو اس کا متوقع پایا اس لئے کھڑے ہوتے۔ اسی طرح کے اور احتمالات بھی ہو سکتے ہیں۔ الغرض اسی طرح کی تمام احادیث اور روایات کو قیام استقبال، قیام محبت خوشی اور بشارت کے لئے کھڑا ہونا یا تعزیت کے لئے قیام قرار دے کر استدلال کرتے ہیں۔ اور یہ احتمالات اتنے بعید بھی نہیں ہیں، اگرچہ بعض روایات میں اکرام کا پہلو زیادہ واضح ہے۔

(۱۲) جیسا کہ حضرت ہلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر تشریف لاتے تو ہم آپ کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے حَتّٰی یَدْخُلَ بَیْتَهٗ جب تک کہ آپ گھر تشریف نہ لے جاتے[2]۔

قیام کے مخالفین اس کے کئی جوابات دیتے ہیں، یہ قیام بوجہ ضرورت تھا ہر شخص اپنے اپنے کام کے لئے جانا چاہتا تھا۔ یا چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا دروازہ مسجد میں تھا اور مسجد فراخ نہ تھی اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جایا کرتے تھے کہ آپ بآسانی گھر تشریف لے جا سکیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت پیش آتے تو صحابہؓ خدمت کے لئے تیار ہوں، یعنی یہ قیام، قیام خدمت تھا۔

(۱۳) قیام کو جائز قرار دینے والے حضرات سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث

---

[1] بلکہ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو سفر سے آتے تھے تو ان کے لئے یہ قیام فرمانا استقبال کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور عدی رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ضعیف ہے اور حضرت عدیؓ سے مشہور الفاظ جو روایت ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرکت کر کے میرے لئے جگہ کی وسعت فرماتے۔

[2] رواہ البزار وهكذا وجدته فيما جمعته ولعله عن محمد بن هلال عن ابيه عن ابي هريرة وهو الظاهر فان هلالا تابعي ثقة، روى عن محمد بن ابي هلال عن ابيه عن جده وهو بعيد ورجال البزار ثقات. مجمع الزوائد ص ۴۰ ج ۸ ۔ وفي مشكل الآثار للامام جعفر الطحاوي رحمه الله تعالى عن محمد ابن هلال عن ابيه عن ابي هريرة نحوه (مشكل الآثار ص ۳۸ ج ۲)

جس کو بخاری و مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے سے استدلال کرتے ہیں، اسی حدیث سے امام بخاریؒ، مسلمؒ اور ابوداؤدؒ نے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہود، بنو قریظہ اس وعدہ پر اترے کہ جو فیصلہ بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کریں گے، وہ انہیں قابلِ قبول ہوگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا، وہ آپ کے قریب ہی تھے، پس گدھے پر سوار ہوکر آئے۔ فَلَمَّا دَنَا مِنَ الْمَسْجِدِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْاَنْصَارِ قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ (البخاری کتاب الاستیذان، ومسلم کتاب الجہاد) یعنی جس وقت حضرت سعد رضی اللہ عنہ مسجد کے قریب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا کہ اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

اس کے جواب میں قیام کے مخالفین فرماتے ہیں کہ یہ حکم قیام تعظیمی کے لئے نہ تھا بلکہ سعد بن معاذؓ زخمی تھے اور ران کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ اُن کو گدھے سے اتارنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ یہ قیام مدد اور معاونت کے لئے تھا۔ اگر یہ قیام تعظیمی ہوتا تو یوں فرماتے قُوْمُوْا لِسَیِّدِکُمْ یعنی اپنے سردار کی خاطر کھڑے ہو جاؤ۔ بلکہ بعض روایات میں زیادہ وضاحت بھی آئی ہے کہ قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ فَاَنْزِلُوْہُ۔ اپنے سردار کی طرف اٹھو اور ان کو سواری سے اتار لو۔

مخالفین قیام کے اس استدلال کا جواب موافقین حضرات یوں دیتے ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ ان کے پاس جا کر ان کی تعظیم و تکریم کے لئے سواری سے اتار لو۔ اور اس بات پر قرینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا ہے کہ اپنے سردار کی طرف اٹھو (کھڑے ہو)، تو لفظ سید سے اُن کی تکریم و تعظیم کی طرف اشارہ ہے۔

فقہائے کرام کے اقوال

مذکورہ بالا روایات میں قیام کی ممانعت اور جواز یعنی دونوں جانب بحث و کلام کی کافی گنجائش موجود ہے اور علمائے کرام نے ان پر بہت طویل بحثیں کی ہیں۔ حضرت نوویؒ نے قیام کے جواز پر پوری کتاب

لکھی ہے اور طبرانیؒ وغیرہ نے اس کے جواز میں روایات و واقعات نقل کر کے ان روایات کو بھرپور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن سے قیام کی ممانعت معلوم ہوتی ہے اور ان کی عمدہ تاویلیں بھی فرماتی ہیں۔

(۲) ابن الحاجؒ وغیرہ نے اختلافی قیام کے ناپسندیدہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے پوری تفصیل سے مدلل بحث کی ہے اور انہوں نے حضرت امام نوویؒ کے پورے رسالہ کو اپنی کتاب مدخل میں نقل کر کے اس سے عمدہ جوابات دیئے ہیں۔ جن کو فتح الباری نے بہت جامع اور مختصر انداز سے نقل کیا ہے۔

جمہور علماء نے اہلِ فضل حضرات کے آنے پر ان کے اکرام کے لئے کھڑے ہو جانے کو جائز بلکہ مستحب فرمایا ہے۔

(۳) چنانچہ مجمع البحار میں ہے وَاحْتَجَّ بِهِ الْجَمَاهِيْرُ لِإِكْرَامِ أَهْلِ الْفَضْلِ بِالْقِيَامِ إِذَا أَقْبَلُوْا (مجمع البحار ص ۱۸۲ ج ۳) یعنی جمہور علمائے کرام نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اہلِ فضل کے اکرام کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے جب وہ آئیں۔

(۴) اور درمختار میں ہے آنے والے کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا جائز بلکہ مستحب ہے

(۵) اور حضرت امام حجر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وَرَجَّحَ الْمُنْذِرِيُّ مَا تَقَدَّمَ مِنَ الْجَمْعِ عَنْ قُتَيْبَةَ وَالْبُخَارِيِّ إِنَّ الْقِيَامَ الْمَنْهِيَّ عَنْهُ أَنْ يُقَامَ عَلَيْهِ وَهُوَ جَالِسٌ (فتح الباری ص ۳۹ ج ۱۱) یعنی منذری رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت قتیبہؒ اور بخاریؒ سے منع اور جواز کی روایات و واقعات میں، جو تطبیق کی گئی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی اس کو پسند فرمایا ہے اور ترجیح دی ہے (یعنی کسی مسلمان بھائی کے اکرام کے لئے قیام جائز ہے، اور ممنوع وہ قیام ہے کہ کسی شخص کے ارد گرد یا سامنے لوگ کھڑے ہوں اور وہ بیٹھا ہو۔

(۶) طحطاویؒ شرح درمختار میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علماء تعظیم کے لئے کھڑا ہونے میں مختلف ہو گئے ہیں، بعض نے منع کیا ہے بوجہ ابوداؤد کی حدیث کے جو انہوں نے ابوامامہ سے روایت کی ہے پھر اس کو پورا نقل کرنے کے

بعد فرمایا ہے کہ بعض نے اس کو (قیام کو) جائز کہا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے قیام کرتے تھے، اور بعضوں نے اس میں تفصیل کی ہے جیسے قاضی خان فرماتے ہیں۔ قَوْمٌ یَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ مِنَ الْمُصْحَفِ اَوْ یَقْرَأُ رَجُلٌ وَاحِدٌ فَدَخَلَ عَلَیْهِمْ وَاحِدٌ مِّنَ الْاَجِلَّةِ وَالْاَشْرَافِ فَقَامَ الْقَارِیُ لِاَجْلِهٖ قَالُوْا اِنْ دَخَلَ عَلَیْهِ عَالِمٌ اَوْ اَبُوْهُ اَوْ اُسْتَاذُهُ الَّذِیْ عَلَّمَهُ الْعِلْمَ جَازَ لَهٗ اَنْ یَّقُوْمَ لِاَجْلِهٖ وَفِیْمَا سِوٰی ذٰلِكَ لَا یَجُوْزُ اھ وَفِیْ مَجْمَعِ الْفَتَاوٰی لِلْاَنْطَاکِیْ قِیَامُ الْقَارِیِ جَائِزٌ اِذَا جَاءَ اَعْلَمُ مِنْهُ اَوْ اُسْتَاذُهُ الَّذِیْ عَلَّمَهُ الْقُرْآنَ اَوِ الْعِلْمَ اَوْ اَبُوْهُ اَوْ اُمُّهٗ لَا یَجُوْزُ لِغَیْرِهِمْ وَاِنْ کَانَ الْجَائِیْ مِنَ الْاَجِلَّةِ وَالْاَشْرَافِ وَنَقَلَ الشُّرُنْبُلَالِیْ عَنِ ابْنِ وَهْبَانَ مَا نَصُّهٗ اَقُوْلُ فِیْ عَصْرِنَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّسْتَحَبَّ ذٰلِكَ اَیِ الْقِیَامُ[1] (الطحطاوی علی الدر المختار ص ۱۹۲ ج ۴) یعنی کوئی قوم یا فرد تلاوت قرآن میں مشغول ہو اور اس پر کوئی اہل فضل و شرف میں سے داخل ہو جائے تو علماء فرماتے ہیں کہ اگر وہ عالم ہو یا اس کا والد یا اس کا استاذ تو اس (قرآن پڑھنے والے) کے لئے جائز ہے کہ ان کے لئے کھڑا ہو جائے، اور ان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کھڑا ہونا درست نہیں، اور مجمع الفتاوی انطاکی میں ہے کہ جب اس سے زیادہ عالم یا اس کا ایسا استاذ جس نے اس کو قرآن مجید یا علم سکھایا ہو، یا اس کا باپ یا ماں آجائے تو ان کے لئے کھڑا ہونا جائز اور ان کے علاوہ اور کسی کے لئے جائز نہیں، اگرچہ آنے والا اہل فضل و شرافت والا ہو، اور شرنبلالیؒ نے ابن وہبان سے نقل کیا ہے جس پر انھوں نے تصریح کی ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں یہ کھڑا ہونا مستحب ہونا چاہئیے۔

(۷) اور رد المختار میں اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قَالَ فِی الْقُنْیَةِ قِیَامُ

---

[1] فتاوی قاضی خان ص ۳۰۶ ج ۴ وقال الملا علی قاری رحمہ اللہ کذا احتج بالحدیث جماہیر العلماء و قال القاضی عیاض القیام المنہی تشبیہ قیاما طول جلوسہ. وقال النووی ہذا القیام للقادم من اہل الفضل مستحب وقد جاءت الاحادیث ولم یصح فی النہی عنہ شئی.

[2] وفی البنایۃ شرح الہدایۃ للعلامۃ العینی ص ۲۵۵ ج ۴ نحوہ۔

اَلْجَالِسِ فِي الْمَسْجِدِ لِمَنْ دَخَلَ عَلَيْهِ تَعْظِيْمًا وَقِيَامُ قَارِئِ الْقُرْآنِ لِمَنْ يَجِيْءُ تَعْظِيْمًا لَا يُكْرَهُ إِذَا كَانَ مِمَّنْ يَسْتَحِقُّ التَّعْظِيْمَ وَفِي مُشْكِلِ الْآثَارِ اَلْقِيَامُ لِغَيْرِهِ لَيْسَ بِمَكْرُوْهٍ لِعَيْنِهِ إِنَّمَا الْمَكْرُوْهُ مَحَبَّةُ الْقِيَامِ لِمَنْ يُقَامُ لَهُ فَإِنْ قَامَ لِمَنْ يُقَامُ لَهُ لَا يُكْرَهُ۔ یعنی قنیہ میں ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا ایسے آدمی کے لئے کھڑا ہونا جو اس پر داخل ہوا اور تلاوت قرآن کرنے والے کا ایسے آدمی کے لئے جو اس کے پاس آئے، تعظیماً کھڑا ہونا مکروہ نہیں، جب کہ وہ تعظیم کا مستحق ہو اور حضرت امام طحاویؒ کی کتاب مشکل الآثار میں ہے کہ غیر کے لئے کھڑا ہونا بذات خود مکروہ نہیں بلکہ مکروہ قیام کی محبت و خواہش ہے ایسے شخص کے لئے جس کے لئے (لوگ) کھڑے ہو جایا کرتے ہیں، اور اگر کوئی کھڑا ہو گیا ایسے آدمی کے لئے جس کے لئے (لوگ) کھڑے نہیں ہوا کرتے تو مکروہ نہیں۔

آگے جا کر فرماتے ہیں کہ وَمَا وَرَدَ مِنَ التَّوَعُّدِ عَلَيْهِ فِيْ مَنْ يُحِبُّ الْقِيَامَ بَيْنَ يَدَيْهِ كَمَا يَفْعَلُهُ التُّرْكُ وَالْأَعَاجِمُ۔ اور جو وعید (حدیث شریف میں) اس پر (قیام پر) آئی ہے تو وہ ایسے شخص کے بارے میں ہے جو اپنے سامنے لوگوں کے کھڑا ہونے کو پسند کرتا ہو، جیسا کہ ترک اور عجمی لوگ کرتے ہیں۔

(۸) ہمارے علماء کے درمیان اس مسئلہ میں بھی کچھ اختلاف ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے یا تلاوت کرنے والے شخص کے لئے کسی آنے والے کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے یا ناجائز۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ قاضی خان اور دیگر وغیرہ مسجد میں بھی کھڑا ہونے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن کنز العباد وغیرہ میں تعظیم و تکریم کے لئے مسجد میں کھڑا ہونے کو منع فرمایا ہے اور اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے، لَا تَقُوْمُوْا لِيْ فِيْ بَيْتِ رَبِّيْ یعنی میرے رب کے گھر میں میری تعظیم نہ کیا کریں۔ اس پر کلام کرتے ہوئے علامہ ابو مسعود رحمہ اللہ نقل فرماتے ہیں قَالَ وَلِهٰذَا أَوْصَى السَّلَفُ تَلَامِذَتَهُمْ

ؔ ردالمحتار ص ۳۶۱ ج ۵ و مشکل الآثار ص ۳۹ ج ۲

اَنْ لَا یَقُوْمُوْا لَھُمْ فِی الْمَسْجِدِ اِذَا دَرَسُوْا اَوْقَالَ فِیْہِ اِشَارَۃٌ اِلٰی جَوَازِ مَا تُعُوْرِفَ فِیْ زَمَانِنَا الْقِیَامُ فِیْ غَیْرِ الْمَسْجِدِ عِنْدَ اِتْمَامِ الدَّرْسِ الخ (فتح المعین للعلامۃ المسعود ص ۴۰۲ ج ۳) فرماتے ہیں کہ اس لئے ہمارے سلف اپنے شاگردوں کو وصیت فرماتے کہ ان کے لئے مسجد میں کھڑے نہ ہوں جس وقت وہ درس دیتے ہوں اور فرمایا کہ اس میں ہمارے زمانے کے متعارف قیام جو درس کے اختتام پر مسجد سے خارج ہوتا ہے کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس قیام کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے کہ کسی آنے والے کے لئے تعظیماً کھڑا ہوا جائے یا نہ۔ اکثر اس کے جواز بلکہ استحباب کے قائل ہیں بشرطیکہ آنے والا شخص اہل فضیلت میں سے ہو اور تعظیم و تکریم کا مستحق ہو بلکہ بعض علماء کے اقوال سے متنازع فیہ قیام میں بھی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے جیسے ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ قَالَ الْاِمَامُ حُجَّۃُ الْاِسْلَامِ اَلْقِیَامُ مَکْرُوْہٌ عَلٰی سَبِیْلِ الْاِعْظَامِ لَا عَلٰی سَبِیْلِ الْاِکْرَامِ (المرقاۃ باب القیام ص ۵۸۲ ج ۴) یعنی امام حجۃ الاسلام فرماتے ہیں کہ کسی کے لئے بطور تعظیم کھڑا ہونا مکروہ ہے اور صرف اکرام کے لئے ہو تو مکروہ نہیں۔

اور فتح الباری میں اس بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں قَالَ الْغَزَالِیْ اَلْقِیَامُ عَلٰی سَبِیْلِ الْاِعْظَامِ مَکْرُوْہٌ وَعَلٰی سَبِیْلِ الْاِکْرَامِ لَا یُکْرَہُ وَھٰذَا تَفْصِیْلٌ حَسَنٌ (فتح الباری ص ۴۳ ج ۱۱) یعنی امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قیام بطورِ تعظیم مکروہ ہے اور جو اکرام کی وجہ سے ہو تو مکروہ نہیں، اور یہ اچھی تفصیل ہے۔

اب اگر اس سے مراد وہی ہو جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عجمیوں کے دستور کے مطابق کھڑا ہونا تو ممنوع ہے اور علماء و مشائخ کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے (جیسا کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس تفصیل سے گویا یہی مطلب سمجھا ہے) پھر تو جمہور علماء کے قول

لہ جیسا کہ حضرت ملا علی قاری مذکورہ بالا قول کے تحت لکھتے ہیں کہ لعل اراد بالاکرام القیام التحیۃ لمزید المحبۃ و بالاعظام التمثل لہ بالقیام وھو جالس علیٰ عادۃ الامراء العجم (المرقاۃ ص ۵۸۲ ج ۴) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اس میں کوئی فرق نہیں، اور اگر اس قول سے مراد ان کا اسی قیام تعظیم و تکریم جو دینی شرف ہی کی وجہ سے کیا جاتا ہے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہو پھر تو تعظیم کے لئے کھڑا ہونا مکروہ اور اکرام کی خاطر جائز ہے، اسی طرح گویا متنازع فیہ قیام ہی میں تفصیل (یا فرق) کرنا مقصود ہوا، اور امام ابن حجر رحمہ اللہ نے آخر میں ہذا التفصیل حسن فرما کر غالباً یہی فرق مراد لیا ہے کیونکہ بظاہر الفاظ اسی مطلب کی تائید کرتے ہیں،

اور امام ابوداؤدؒ نے سنن ابی داؤد میں جواز اور منع پر جو مختلف ابواب جس انداز سے وضع کئے ہیں اور اسی طرح بعض دوسرے حضرات کے اقوال سے اسی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ قیام تعظیمی کو مکروہ فرماتے ہیں اگرچہ عجم کا دستور نہ بھی ہو لیکن مسلمان بھائی کے اکرام کے لئے قیام کو جائز فرماتے ہیں، بہرحال اگر اس تفصیل (فرق) کو تعظیمی قیام ہی میں مان لیا جائے تو شاید پھر اس کے جواز میں کسی کو بھی کلام نہ رہے گا کیونکہ مجلس سے فراغت کے بعد صحابہؓ کا قیام اور انتظار فرمانا حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے جاتے اس روایت کو ضرورت پر اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قیام کو محبت اور انصار کے قیام کو حضرت معاذؓ کی مدد پر محمول کیا جائے (اگرچہ ان روایات میں قیام تعظیم کی کافی گنجائش ہے) تب بھی ان کو اکرام سے خالی ماننے کی کوئی خاص وجہ نہیں، ان سارے واقعات میں اکرام واحترام کا تصور بھی موجود ہے، پھر محبت اور اکرام کے حکم میں بھی کوئی خاص فرق نہیں جیسے محبت اپنے محل وموقع میں جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہوتی ہے، اسی طرح کسی مسلمان بھائی کا اکرام اور مہمان کا اکرام چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو بھی ضروری ہے اور ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یعنی شاید امام حجۃ الاسلام کی مراد قیام اکرام سے قیام تحیہ وسلام ہو جو کہ محبت کے بڑھانے کے لئے ہوا کرتا ہے جیسا کہ اس پر مصافحہ دلالت کرتا ہے اور قیام اعظام سے مراد ان کا وہ قیام ہو جس میں وہ امراء اور بڑے لوگوں کی عادت کے مطابق بیٹھا ہو اور لوگ اس کے لئے سیدھے (تعظیم) کے لئے کھڑے ہوں،

لہ حیث قال ابوداؤد باب فی القیام الاحادیث التی تدل علی الجواز ثم ترجم بعد قصۃ ابواب باب الرجل یقوم للرجل یعظمہ بذالک (کتاب الادب ابوداؤد)

البتہ کسی غیر کی توقیر و تعظیم اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہے لیکن پھر بھی اکرام اور تعظیم کے حکم میں فرق صاف طور پر واضح ہے، ہمیں بعض لوگوں کا اکرام کرنے کا تو حکم ہے لیکن تعظیم کی ممانعت ہے جیسے کافر مہمان وغیرہ کا اکرام جائز اور اس کی تعظیم ممنوع ہے،

اور علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ کسی آنے والے کے لئے ذبح کرنے کے حکم میں فرق کرتے ہوئے فرماتے ہیں، فَإِنْ قَصَدَ التَّعْظِيمَ لَا تَحِلُّ ...... وَإِنْ قَصَدَ الْإِكْرَامَ تَحِلُّ (ردالمحتار [illegible]) یعنی اگر ذبح کرنے میں نیت اور قصد تعظیم کی ہے تو یہ مذبوحہ حلال نہیں اور اگر قصد اکرام کی ہے تو حلال ہے۔

قیام اکرام اور قیام تعظیم میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ قیام تعظیم اور قیام اکرام میں فرق کیسے کیا جائے، اس فرق کو علماء کے اقوال سے کچھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کے یہاں کوئی شخص آئے اور آپ اس کے لئے کھڑے ہو جائیں، آگے بڑھ کر مصافحہ و سلام کریں اور اپنی جگہ پر بٹھائیں یا پھر کسی کو رخصت کرتے وقت اس کے لئے کھڑا ہونا وغیرہ، یہ سب کچھ اکرام و احترام میں داخل ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی غیر آپ کی طرف نہ آ رہا ہو کسی دوسری طرف جا رہا ہو یا ویسے ہی راستے سے گزر رہا ہو، اس کو دیکھ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانا، یہ برتاؤ اکرام سے باہر اور داخل تعظیم ہے۔ اسی طرح اور بھی قرائن ہو سکتے ہیں، جن کے ذریعے قیام اکرام اور قیام تعظیم میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اسی فرق کے بارے میں علامہ ابن قیم کے قول سے بھی اشارہ مل سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں، وَالْقِيَامُ يَنْقَسِمُ إِلَى ثَلَاثِ مَرَاتِبَ قِيَامٌ عَلَى رَأْسِ الرَّجُلِ وَهُوَ فِعْلُ الْجَبَابِرَةِ وَقِيَامٌ إِلَيْهِ عِنْدَ قُدُومِهِ وَلَا بَأْسَ بِهِ وَقِيَامٌ لَهُ عِنْدَ رُؤْيَتِهِ وَهُوَ الْمُتَنَازَعُ فِيهِ۔ یعنی قیام کے تین مراتب ہیں (پہلا یہ کہ) کسی کے سر پر (یعنی ارد گرد یا سامنے جب کہ وہ بیٹھا ہوا ہو) یہ تو جابر اور متکبر لوگوں کا فعل ہے (جو بالاتفاق ناجائز ہے) (دوسرا یہ کہ) کسی کے لئے کھڑے ہو جانا جب وہ آئے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور (تیسرا یہ کہ) اس کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جائے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

ایک دوسری جگہ پر حافظ ابن قیم سے منقول ہے إِنَّ الْقِيَامَ عَلَى ثَلَاثَةٍ

اَقْسَامٍ اَلْاَوَّلُ اَنْ یَّکُوْنَ رَجُلٌ مُقْتَدًی یَذْھَبُ لِحَاجَتِہٖ اِلٰی جَانِبٍ آخَرَ وَلَا یَاْتِیْ اِلٰی ھٰذَا الرَّجُلِ الْقَائِمِ فَھٰذَا مَنْھِیٌّ عَنْہُ وَالثَّانِیْ اَنْ یَّاْتِیَ مُقْتَدًی اِلٰی ھٰذَا الْقَائِمِ فَقِیَامُہٗ لَہٗ جَائِزٌ وَقِیْلَ مُسْتَحَبٌّ اَقُوْلُ عِنْدِیْ اَنَّہٗ غَیْرُ مَرْضِیٍّ اِذَا بُوْلِغَ فِیْہِ وَالثَّالِثُ اَنْ یَّکُوْنَ الْمُقْتَدٰی جَالِسٌ وَالنَّاسُ قَائِمِیْنَ فَھٰذَا طَرِیْقُ الْاَعَاجِمِ۔ یعنی قیام کی تین قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ مقتدیٰ اور پیشوا آدمی کسی ضرورت سے کسی دوسری طرف جا رہا ہو اور قیام کرنے والے شخص کی طرف نہیں آتا تو اس شخص کا قیام (اس مقتدیٰ) کے لئے منع ہے۔ دوسری قسم یہ کہ مقتدیٰ (امام) آدمی اس کھڑے ہونے والے شخص کے پاس آرہا ہو تو اس آدمی کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ مستحب ہے۔ (لیکن) میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ قیام بھی ناپسندیدہ ہے جب کہ اس میں مبالغہ کیا جائے تیسری قسم (قیام کی) یہ ہے کہ مقتدیٰ بیٹھا ہوا ہو اور لوگ (اس کے سامنے یا ارد گرد) کھڑے ہوں۔ یہی اعاجم کا دستور ہے۔

ان عبارات میں غور کرنے سے اکرام کے قیام اور تعظیم کے قیام میں فرق واضح ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی آمد پر اس کے اکرام کے لئے کھڑا ہونا کسی کے نزدیک بھی ناجائز نہیں۔ غور کا مقام ہے کہ علامہ ابن قیم متنازع فیہ قیام میں، قیام سے منع کرنے والے حضرات کے ساتھ ہیں۔ لیکن پھر بھی اوپر بیان کردہ دوسری قسم کے قیام کو مکروہ اور ناجائز نہیں فرماتے جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ قیام جس میں اختلاف ہے، صرف وہی قیام تعظیم و تکریم ہے جو علماء کرام اور مشائخ عظام کی عظمت و تعظیم کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ بہرحال یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس قسم کے اختلاف کو چاہے کتنا ہی شدید طور پر متنازع فیہ کیوں نہ ہو، کفر و شرک کے برابر اختلاف بنا لینا یا کفر و شرک جیسا اختلاف ماننا اور عوام کو اس غلط نظریہ کا باور کرانا بہت بڑا ظلم ہے۔

چاہے کوئی قیام کو جائز سمجھتا ہو یا اس کا مخالف ہو، دونوں کے لئے ایک دوسرے پر بے جا الزامات لگانا کوئی دینی خدمت نہیں، اسی طرح قیام تعظیم و تکریم

[illegible]

کو جائز سمجھ کر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ رکوع اور سجدۂ تعظیم بھی جائز ہیں، یہ بھی ظلم عظیم ہے، کیونکہ رکوع اور سجدہ تحیۃ کی حرمت صراحۃً ثابت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ اَیَنْحَنِیْ بَعْضُنَا لِبَعْضٍ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا"[1] اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کی ذات مبارک ہی کے لئے سجدہ کرنے کے بارے میں عرض کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ تیسری بات یہ کہ قیام کی بعض قسمیں تو باجماع امت جائز اور ثابت ہیں، لیکن سجدہ اور رکوع کی کوئی قسم بغرض رکوع اور سجود دین اسلام میں جائز نہیں، اور نہ صراحۃً ثابت ہے۔

---

[1] کیا ہم میں کوئی کسی دوسرے کے لئے جھکے؟ تو فرمایا کہ نہیں۔

باب چہارم

توسل بالاعمال والذوات الصالحہ

باب نمبر۴

دُعا اور توسّل

انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے یا کسی مرض اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غرض جب اس کو کوئی ایسا مسئلہ پیش آتا ہے جس کا حل اسباب کے تحت اپنے ممکن وسائل اور ذرائع کی حدود میں اس کو نہیں ملتا، تو ایسی حالت میں وہ ایک ایسی ہستی سے اس مسئلہ کے حل اور اس حاجت برآری کے لئے سوال کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی پکار کو سُن رہا ہے اور اس کی ہر مشکل اور حاجت کو جانتا اور دیکھتا ہے نیز وہ مشکلات و مصائب کو دور کرنے حاجات اور ضروریات کے پورا کرنے پر بھی قادر ہے اور کلی اختیار اس کو حاصل ہے۔

دین اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے، وہ اسبابؒ و ذرائع سے بالاتر اختیار و اقتدار کا مالک ہے۔ اور

لہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسباب کے ماتحت کسی سے مدد مانگنا وہ خاص استعانت (یعنی مدد طلب کرنا) اور دعا نہیں جو صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مختلف قسم کے اسباب پیدا فرمائے ہیں، ان میں تاثیر رکھی ہے جیسے آگ سے گرمی کا حصول، پانی سے پیاس کا ختم یا کم ہونا یا جیسے مریضوں کی شفایابی کے لئے ادویات کا استعمال اور ماہرین طب کے ہاں جانا، حصول علم کے لئے صحبت استاد کا کارگر ہونا، اسی طرح ہر انسان دوسرے انسانوں سے مدد حاصل کرتا ہے، معمار کو صاحب عمارت کی ضرورت، صاحب عمارت کو معمار کی ضرورت، گاہک کو سامان کی ضرورت ہے تاجر کو گاہک کی ضرورت غرض صنعت کار مزدور، حاکم و محکوم وغیرہ جو بھی ہوں ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں، ہر انسان مادی اسباب سے فائدہ اٹھانے اور دوسروں سے کام لینے کا محتاج ہوتا ہے ان سے مدد حاصل کرتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کا نظام چل رہا ہے اور یہ مدد مانگنا کسی بھی دین و شریعت میں ناجائز اور ممنوع نہیں بلکہ ناجائز و ممنوع وہ استعانت ہے جس میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو صاحب اختیار مان کر دیا تی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کا یہ اختیار و اقتدار اور قدرت ایسی بے نہایت ہے کہ اس کے ارادے کے بغیر کوئی پتا نہ ہل سکتا ہے اور نہ گر سکتا ہے۔ وہ ہر جگہ ہر وقت تمام مخلوق کے حالات اور ضروریات کو پوری طرح جانتا اور دیکھتا ہے، وہی قسمتوں کا بنانے والا مشکلوں کا حل کرنے والا، حاجات کو پورا کرنے والا اور مصیبتوں کو دفع کرنے والا ہے۔ یہاں تک تو کفار و مشرکین بھی مانتے ہیں کہ قادر مطلق اور مختار کل سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی دوسرا نہیں، البتہ مسلمانوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی فرشتہ، نبی اور ولی یا کسی دوسری مخلوق کو کسی دائرہ میں کوئی اختیار و قدرت ایسی سپرد نہیں کی ہے جس کی وجہ سے وہ اس دائرہ میں کسی کا کام خود مختاری سے پورا کر دے اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ کسی کی دعا کو قبول کرے یا اسے رد کرے، اس لئے ایک مسلمان صرف اللہ سے ہی دعا مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرتا ہے کہ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (المومن آیت ۶۰)

"اور تمہارے پروردگار نے فرمایا مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کر کے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔

دُعا عبادت ہے

اگرچہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ "تم میری عبادت کرو، میں تمہیں ثواب دوں گا" اور بعض نے وہ مفہوم لیا ہے جو اوپر ترجمہ میں بیان کیا گیا ہے، لیکن حقیقت میں دونوں تفسیریں ہم معنی ہیں ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں، کیونکہ عبادت اور دُعا اگرچہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے دونوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس سے اسباب سے بالاتر کوئی چیز مانگی جائے۔

لہ مشرکین عرب اگرچہ یہ کہتے تھے کہ قادر مطلق اور کامل اختیارات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کے سپرد کیا ہے، اور وہ شخص اسی دائرہ میں خود مختار ہے اس لئے وہ بتوں و دیوتاؤں کو پکارتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے جیسا کہ پچھلے صفحات میں یہ مفصل گزر چکا ہے۔

جداجدا ہیں مگر مصداق کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفاوت نہیں، اس لئے یہاں پہلے فقرے میں جس چیز کو دعا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اسی کو دوسرے فقرے میں عبادت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت نام ہے کسی کے سامنے انتہا درجہ کی عاجزی اور تذلل اختیار کرنے کا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب بندہ اپنے پروردگار کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کر کے اور اس سے دعا مانگتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اس کی آقائی کا اعتراف اور اپنی بندگی و عاجزی کا اقرار کرتا ہے، تو یہ اظہارِ بندگی بجائے خود عبادت بلکہ روحِ عبادت ہے اور اس پر کہ دعا عبادت ہی ہے، رحمۃ للعالمین خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات موجود ہیں۔

چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ وَرَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔ یعنی دعا عبادت ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے استدلال میں، یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ [1]۔

اور سنن الترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے (سنن الترمذی ابواب الدعوات)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز مکرم نہیں (سنن الترمذی ابواب الدعوات ج ۲)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُوْ بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيْهَا اِثْمٌ وَلَا قَطِيْعَةُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا

---

[1] الترمذی ابواب الدعوات ج ۲۔ اسی حدیث شریف کو مسند احمد، ابوداود، النسائی، ابن ماجہ وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔ امام ترمذی اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ہذا حدیث حسن صحیح۔

إِحْدَىٰ ثَلَاثٍ إِمَّا أَنْ يُعَجِّلَ لَهُ دَعْوَتَهُ وَإِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهَا قَالُوا إِذًا نُكْثِرُ قَالَ ۔ اللّٰهُ أَكْثَرُ (رواہ احمد کذا فی المشکوٰۃ کتاب الدعوات) یعنی ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے یا تو جو مانگتا ہے وہی دنیا میں عطا کرتا ہے یا اس دعا کو آخرت میں اجر و ثواب دینے کے لئے محفوظ کر دیتا ہے یا اس کو وہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر اسی درجہ کی آفت اور مصیبت جو اس پر آنے والی تھی اس پر آنے سے روک لیتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا پھر تو ہم کثرت سے دعا مانگا کریں گے (اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا فضل و عطا بہت زیادہ ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ سے مانگنے پر دنیا و آخرت کا اجر و ثواب ملتا ہے، اسی طرح اگر کوئی اپنے آپ کو مستغنی سمجھے اور تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں پر عتاب فرمایا ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ کے دوسرے فقرے میں ارشاد ہے۔ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔ یعنی بے شک جو لوگ میری عبادت سے (یعنی دعا اور عبادت سے بوجہ استغنا۔ اور تکبر منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ (الترمذی ابواب الدعوات ج ۲)، یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے (اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر بوجہ تکبر کے) اپنی حاجت کا سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوتا ہے۔

غرض دعا عبادت بلکہ مغز اور روح عبادت ہے۔ اس لئے جس طرح دوسری عبادات صوم صلوٰۃ، نذر و نیاز وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کئے جاتے ہیں اسی طرح دعا بھی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اسی سے مانگی جاتی ہے۔

لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو صاحب اختیار جان کر اس سے اسباب

سے بالاتر کسی چیز کا سوال کرتا ہے وہ صریح شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔

جب دعا کی حقیقت اور اس کی حیثیت سے واقفیت ہوئی تو مناسب یہ ہے کہ کسی عمل یا کسی مقبول بندہ پر دعا میں توسل کرنے کی حقیقت اور حیثیت کو بھی واضح کر دیا جائے تاکہ جائز و ناجائز توسل میں فرق و امتیاز کھل کر سامنے آجائے۔

دعا میں توسل کی اقسام

دعا میں توسل کی کئی قسمیں ہیں بعض ان میں بالاتفاق جائز ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے وسیلہ اور ذریعہ سے یا حمد و ثنا۔ درود شریف پڑھ کر دعا مانگنا وغیرہ اور بعض اقسام بالاتفاق ناجائز مثلاً کسی مخلوق سے براہ راست کوئی ایسی چیز مانگنا جو اسباب سے بالاتر ہو، مثلاً کسی انسان یا فرشتہ سے یا جن کو صاحب اختیار جان کر ان سے اولاد وغیرہ مانگنا۔

استشفاع

توسل کی ایک قسم استشفاع ہے جس میں کسی مخلوق سے براہ راست تو اپنی حاجات نہیں مانگی جاتیں، البتہ ان کی خدمت میں گزارش کی جاتی ہے کہ وہ حق تعالیٰ شانہٗ کے دربار میں ہماری حاجت اور مراد پوری ہونے کی دعا فرمائیں اس کا حکم یہ ہے کہ جو حضرات دنیا میں تشریف فرما ہیں ان سے دعا کی درخواست کرنا بالاجماع جائز بلکہ مستحب ہے۔ البتہ وہ نیک و صالح جو اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کی قبور پر جا کر ان سے دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اس میں ہمارے علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض اُسے جائز کہتے ہیں اور بعض اس کو ناجائز اور بدعت کہتے ہیں، جو حضرات توسل کی اس قسم کو بدعت اور ناجائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح توسل کے اختیار کرنے سے شرک میں پڑ جانے کا خطرہ ہے۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ نیک اور صالح شخص سے اگر ان کی حیات میں دعا مانگی جائے تو یہ آپ کے نزدیک بھی جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے تو پھر اس کے مرنے کے بعد (اگرچہ آپ مُردوں کے سننے کے قائل بھی ہیں) اس سے دُعا کی درخواست کرنا بدعت اور ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اس سوال کے جواب میں فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صالح شخص سے سوال کرنے میں اور وفات کے بعد یا غائب ہونے کی صورت میں ان سے سوال کرنے میں فرق یہ ہے کہ زندگی میں تو کوئی ان کی پرستش نہیں کر سکتا تھا کیونکہ انبیاء وصالحین اپنی زندگی کے اندر اپنے حضور میں کسی مشرکانہ حرکت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ روکتے تھے اور اس پر سزا دیتے تھے۔ اس پر حضرت حافظؒ نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا قول اس پر شاہد ہے۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

(مائدہ آیت ۱۱۷)

یعنی تو نے جو مجھے حکم دیا تھا بس وہی میں نے انہیں کہہ سنایا تھا کہ اللہ جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اسی کی عبادت کرو اور جب تک میں ان میں موجود رہا ان کا نگران حال رہا پھر جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو تمام چیزوں کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے یوں کہا۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَشِئْتَ۔ تو آپ نے فرمایا۔ اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ۔ کیا تو نے اللہ کا شریک بنا دیا بس یوں کہو۔ اللہ وحدہ جو چاہے۔ اور اس کو نصیحت کر کے فرمایا کہ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ مت کہا کرو بلکہ یوں کہہ دیا کرو۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ ثُمَّ شَاءَ مُحَمَّدٌ جو اللہ کی مرضی اور اس کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی مرضی۔

اسی طرح ایک شادی کے موقع پر انصار کی بچیاں اپنے ان آباء واجداد کی شجاعت بیان کرتی تھیں جو بدر کے دن شہید ہو گئے تھے، تو ان میں سے ایک بچی نے جب یہ کہا۔ وَفِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ۔ ہم میں اللہ کے رسول موجود ہیں جو آئندہ کل کی بات جانتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دَعِیْ ھٰذِہٖ وَقُوْلِیْ بِالَّذِیْ کُنْتِ تَقُوْلِیْنَ۔ ایسا مت کہہ اور جو تو پہلے کہتی تھی وہی کہہ۔ اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نماز میں، صف بستہ آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے

ہوتے تھے، تو فرمایا: لَا تُعَظِّمُوْنِیْ کَمَا تُعَظِّمُ الْاَعَاجِمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔ اسی طرح میری
عزت و تعظیم نہ کرو جیسے عجمی لوگ ایک دوسرے کی کیا کرتے ہیں۔

اسی طرح جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنے
کا ارادہ کیا تو آپ نے منع فرمایا اور کہا: اِنَّهٗ لَا يَصْلُحُ السُّجُوْدُ اِلَّا لِلّٰهِ، وَلَوْ كُنْتُ اٰمِرًا
اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهٖ
عَلَيْهَا۔ یعنی سجدہ فقط اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اگر میں کسی شخص کو کسی شخص کے لئے
سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کرے کیونکہ شوہر کا بیوی پر بہت
بڑا حق ہے۔

اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں زنادقہ کا وہ گروہ[1] پیش ہوا جو ان
کی خدائی کا قائل تھا تو آپ نے ان کے جلا دینے کا حکم دیا۔

---

[1] ملحوظ رہے کہ زنادقہ کا وہ گروہ تھا جو عبداللہ ابن سبا کے پیروکار تھے اپنے کو شیعان علی باور
کراتے تھے حالانکہ ان کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبداللہ بن سبا یمن کا یہودی عالم تھا اس
منافق نے اسی ارادے اور منصوبے کے تحت یہودیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا جس کے تحت سینٹ پال
(پولس) نے یہودیت چھوڑ کے عیسائیت قبول کی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو مسخ کر ڈالا تھا۔ ابن
سبا نے بھی وہی کچھ کرنا چاہا جو سینٹ پال نے کیا تھا چنانچہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ غیر معمولی
عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی شان میں طرح طرح کی غلو کی باتیں کرنا شروع کیں۔ ان کی طرف
عجیب عجیب معجزے منسوب کر کے ان کو ایک مافوق البشر ہستی باور کرانے کی کوشش کی۔ بعض کم فہم
نومسلموں کو یہ باور کرایا کہ اللہ نے نبوت و رسالت کے لئے حضرت علی ابن طالب کو منتخب کیا تھا لیکن
جبریل کو اشتباہ ہو گیا اور غلطی سے وحی محمد بن عبداللہ کے پاس لے گئے۔ یہاں تک کہ اس منافق نے کچھ سادہ
لوحوں کو وہی سبق پڑھایا جو ساؤل (پولس) نے عیسائیوں کو پڑھایا تھا۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ حضرت
علی اس دنیا میں خدا کا روپ دھار کر آتے ہیں اور گویا وہی خدا ہیں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی
طرح یہ بات پہنچ گئی کہ ان کے لشکر کے کچھ لوگ ان کے بارے اسی طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں تو آپ نے
ان زندیقوں کو قتل کرا دینے اور لوگوں کی عبرت کے لئے آگ میں ڈلوا دینے کا حکم فرمایا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں پیش کر کے آگے فرماتے ہیں کہ انبیاء اور صالحین کی شان میں غلو کرنا، ان کو رب بنا لینا اور ان کے ساتھ شرک کرنا یہ اس قسم کی باتیں ہیں جو ان کی غیبوبت میں یا ان کی وفات کے بعد حاصل ہوتی ہیں چنانچہ مسیح اور عزیر علیہما السلام کے ساتھ ان کی غیبت اور وفات کے بعد شرک کیا گیا۔ پس یہی راز ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی صالح ولی اللہ کی زندگی میں ان کے روبرو ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکن اس وقت خاص حالات میں اس کارروائی کو دوسرے مناسب وقت کے لئے ملتوی کر دیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رکھنے والے اور اس کی دعوت دینے والے زنادقہ انہی کے حکم سے قتل کئے گئے اور آگ میں ڈال دیئے گئے لیکن پھر بھی ان میں سے بعض سے شیاطین اور خود عبداللہ ابن سبا سرغنہ شیاطین بچ نکلے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے یہ کہنے لگا کہ یہ مقتول حضرت علی نہیں بلکہ شیطان ہے جس نے لوگوں کے سامنے حضرت علی کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ حالانکہ حضرت علی کو اسی طرح آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا گیا تھا۔ وہ اور اس کے پیروکار اسی طرح مکروفریب کر کے لوگوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے۔ چونکہ ان کی یہ دعوت و تحریک خفیہ طور پر اور سرگوشیوں کے ذریعہ جاری تھی اس لئے اس سے متاثر ہونے والے ایک ہی خیال اور عقیدے کے نہیں تھے اس کے داعی جس کو جو بات اور جتنی بات مناسب سمجھتے تھے وہی کہتے اگر وہ اس کو قبول کر لیتا تو وہی اس کا عقیدہ بن جاتا۔ اسی طرح ان کے مختلف فرقے بنتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد ستر سے متجاوز ہو گئی۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ جس طرح پولس یہودی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو مسخ کر دیا تھا اسی طرح یہودی سازش اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کامیابی کا خواب دیکھتے تھے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین و تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسی شدت سے اس فتنہ کی سرکوبی کی جس کی وجہ سے سبائی گروہ رافضی شیعہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ اپنے معتقدات و نظریات کو عقیدہ تقیہ کے نقاب میں چھپائے لیکن عصر حاضر میں تو اس حسن گھڑت عقیدہ تقیہ کے نقاب کو ایسا چاک کر دیا گیا کہ ان کا اصلی چہرہ منظر عام پر آ گیا۔ ان کے خرافات و کفریات کی قلعی ایسی کھل گئی کہ عوام سادہ لوح مسلمان بھی اب ان کی کفریات اور خرافات سے بے خبر نہیں ہیں۔

سوال اور ان کی وفات کے بعد یا غیر حاضری میں ان سے درخواست کرنے میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں بلکہ تمام سلف صالحین میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو انبیاء کی قبور کے پاس نماز پڑھنے کو اختیار و پسند کرتا ہو یا مزارات کے پاس دعا کی ہو، اور نہ کبھی غائبانہ ان سے سوال اور استغاثہ (فریاد خواہی) کرتے تھے نہ قبروں کے پاس، علیٰ ہذا القیاس اعتکاف اور مجاور ہو کر بیٹھنے کا ان سے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں قائلین حضرات فرماتے ہیں کہ بہت سے سلف صالحین فقہاء بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہ بات منقول ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف پر حاضر ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کے بعد ان سے بارگاہ الٰہی میں مغفرت اور سفارش کرانے کی درخواست کرتے تھے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضری کے وقت صلوٰۃ و سلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں مغفرت اور شفاعت وغیرہ کی درخواست کرنے والی دعائیں اور ان دعاؤں کی تعلیم مناسک حج وغیرہ کی کتابوں میں موجود ہے، اس لئے ایسا شخص جو قبر شریف پر حاضر ہو جائے اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعا اور شفاعت کی درخواست کرے تو یہ جمہور علماء کے نزدیک جائز بلکہ مستحسن ہے۔ البتہ حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے ہم خیال علماء اس کو خلاف سنت اور بدعت کہتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا جمہور علماء اس بات کو بھی جائز کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کی قبر پر حاضر ہو کر یہ درخواست کرنا کہ وہ قبر والا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری حاجت پوری ہونے کی دعا کرے، اس کے جواب میں یوں کہا جاتا ہے کہ جو صحابہ کرام اور متقدمین علماء اس بات کے قائل نہیں کہ مردے اپنے زیارت کرنے والے کے سلام، کلام کو سنتے ہیں، ان کے نزدیک تو مردوں کو خطاب کرنا بھی درست نہیں، اس لئے ان میں سے تو کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس طرح توسل کا قائل ہو سکے اور نہ ان حضرات کا یہ معمول ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میت سے دعا کی درخواست کرتے اور سماع موتیٰ کے بارے میں جن حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ قبر کے نزدیک مردے ہماری باتوں کو سنتے ہیں اور جانتے ہیں، تو ان میں سے بھی کسی صحابی یا

متقدمین علماء میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ اس نے کسی صالح یا شہید کی قبر پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کی ہو۔ اس لئے حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد اور علامہ آلوسی اور دیگر متعدد علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اگرچہ اس بات کے قائل ہیں کہ مُردے فی الجملہ سُنتے اور جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس طرح دعا کی درخواست کرنے پر عدم جواز کا فتوےٰ دیتے ہیں اور ان کے نزدیک توسل کرنا بدعت اور ناجائز ہے۔ البتہ بعض متاخرین علماء غیر انبیاء علیہم السلام کی قبور پر جا کر ان سے دعا کی درخواست کرنے کو بھی جائز بتاتے ہیں، لیکن پھر بھی انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی نیک صالح یا شہید کی قبر پر جا کر ان سے دُعا کی درخواست کرنا زیادہ مشتبہ چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے غیر انبیاء علیہم السلام میں مانعین کے قول پر عمل کرنا احوط اور اسلم ہے۔ واللہ اعلم۔

توسل کی اقسام میں سے ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں نزاع تو ضرور ہے لیکن یہ ایسی نزاع نہیں جس کی بنیاد پر کسی ایک فریق کو خواہ قائلین میں سے ہو یا منکرین میں سے مشرک، بدعتی یا گمراہ کہا جائے اور یہاں صرف توسل کی اس قسم پر قدرے تفصیل سے بحث کرنی مقصود ہے تاکہ اس بے خطر توسل میں اختلاف کو دیکھ کر توسل کی دوسری اقسام کی حیثیت بھی واضح ہو جائے۔ اس قسم کے توسل کے ساتھ توسل بالاعمال کی کچھ تشریح اس لئے پیش کی جاتی ہے تاکہ کسی شخصیت پر توسل کرنے کی حقیقت معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

توسل بالاعمال

اپنے نیک اعمال چاہے ظاہری ہوں یا باطنی کی وساطت اور ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے مانگا جائے، سوال کیا جائے۔ توسل کی اس قسم پر قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ اور احادیث شریفہ شاہد ہیں جس میں سے صرف ایک آیت کریمہ اور ایک ہی حدیث پر اکتفا کرتا ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ

یعنی اے ہمارے رب، ہم نے اللہ کی طرف بلانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کو سنا کہ اے لوگو تم اپنے رب کی ذات، صفات پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے اور ہماری برائیاں دور

(آل عمران۔ آیت ۱۹۲) کر دیجئے اور ہم کو نیک لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما کر موت دیجئے۔

اور ایک صحیح حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ تین آدمی کہیں جا رہے تھے، بارش نے انہیں گھیر لیا۔ وہ بارش سے بچنے کے لئے ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑ کا ایک پتھر غار کے منہ پر آگرا اور باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ اب انہوں نے کہا کہ جو اعمال ہم نے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کئے ہیں، ان کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہئے۔ شاید اللہ پاک اس پتھر کو دور کر دے۔ تو ان میں سے ایک نے کہا اے اللہ میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ میں بکریاں چراتا تھا۔ جب شام کے وقت میں واپس آتا اور دودھ دوہتا تو سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو پلاتا۔ ایک دن میں بکریوں کو چرانے کے لئے بہت دور لے گیا اور رات دیر سے لوٹا۔ میرے والدین سو چکے تھے۔ میں نے حسب معمول دودھ دوہا اور ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور یہ بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اپنے بچوں کو ان سے پہلے دودھ پلا دوں۔ بچے بھوک کے مارے چلاتے رہے۔ میرا اور ان کا یہی حال رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ تب والدین جاگے اور انہوں نے پہلے دودھ پی لیا پس اے اللہ اگر میں نے یہ کام خالص تیری رضا کے لئے کیا ہو تو اس پتھر کو اتنا ہٹا دے کہ ہمیں آسمان نظر آ جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے پتھر کو اتنا ہٹا دیا کہ آسمان نظر آنے لگا۔ دوسرے نے عرض کی اے اللہ میرے چچا کی ایک بیٹی تھی مجھ کو اس کے ساتھ ایسی شدید محبت تھی جس قدر کہ آدمی کو عورت سے ہو سکتی ہے۔ میں نے اس سے اس کے نفس کا مطالبہ کیا اس نے انکار کیا۔ یہاں تک کہ ایک سال اسے قحط سے سخت تکلیف پہنچی۔ اور وہ میرے پاس (مجبوراً) آئی۔ میں نے اسے ایک سو بیس دینار اس شرط پر دیئے کہ وہ میری خواہش نفس کو پورا کرے۔ جب میں نے اس پر قابو پا لیا، تو وہ کہنے لگی۔ اے اللہ کے بندے! اللہ سے ڈر اور مہر کو ناحق نہ توڑ، پس میں اس سے فوراً اٹھا اور اس سے اپنا سونا اور دینار بھی واپس نہ لیا، اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام خالص تیری

رضامندی کے لئے کیا ہو تو ہماری مصیبت کو دور کردے۔ پس اللہ تعالیٰ نے غار کے منہ کو تھوڑا اور کھول دیا۔

تیسرا شخص کہنے لگا کہ میں نے کچھ مزدور کام پر لگائے۔ جب انہوں نے کام ختم کردیا تو میں نے سب کو مزدوری دے دی سوائے ایک آدمی کے جس نے (خفا ہو کر) اپنا حق چھوڑ دیا اور چلا گیا۔ میں اس کے حق میں زراعت کرنے لگا یہاں تک کہ بہت سا مال و مویشی جمع ہو گئے۔ کافی مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا اللہ سے ڈر، مجھے میری مزدوری دے دے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب اونٹ، گائے، بیل، بکریاں اور چرواہے لے جاؤ۔ وہ کہنے لگا اے اللہ کے بندے میرے ساتھ مذاق نہ کرو۔ میں نے جواب دیا کہ میں تیرے ساتھ مذاق نہیں کرتا۔ پس وہ ان سب کو لے کر چلا گیا۔ اے اللہ! اگر میں نے یہ کام خالصتہً تیرے لئے کیا ہو تو ہماری تکلیف کو دور کردے۔ اللہ تعالیٰ و تبارک نے اس پتھر کو دور کردیا۔ اور وہ باہر نکل کر چلے گئے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ باب البر والصلۃ)

تینوں حضرات نے اپنے اپنے نیک عمل کے ذریعہ سے دعا کی۔ اسی کو توسل بالاعمال کہتے ہیں۔ اس قسم کا وسیلہ اختیار کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بالاجماع جائز اور مستحسن ہے۔

کسی شخصیت پر توسل

اللہ تبارک و تعالیٰ سے انبیاء علیہم السلام اور صالحین یعنی نیک بندوں کے ذریعے، وسیلے یا واسطے سے دعا کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر متقدمین (پہلے زمانے کے علماء اور فقہائے کرام) میں سے کسی نے خاص بحث نہیں کی اور نہ ہی اس کو صراحتہً منع فرمایا ہے۔ البتہ اس میں حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ نے اختلاف کیا ہے۔ وہ اپنے رسالہ قاعدہ جلیلہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

وَلَفْظُ التَّوَسُّلِ، قَدْ يُرَادُ بِهٖ ثَلٰثَةُ اُمُوْرٍ يُرَادُ بِهٖ اَمْرَانِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِمَا بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَحَدُهُمَا هُوَ اَصْلُ الْاِيْمَانِ وَالْاِسْلَامِ وَهُوَ التَّوَسُّلُ

بِالْإِيْمَانِ بِهٖ، اَیْ بِالرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، وَبِطَاعَتِہٖ، وَالثَّانِی دُعَاؤُہٗ وَشَفَاعَتُہٗ وَھٰذَا اَیْضًا نَافِعٌ الخ (قاعدہ جلیلہ ص ۱۱) یعنی توسل کے تین معنی لئے جاتے ہیں۔ دو معنے تو تمام مسلمانوں کے ہاں بالاتفاق جائز ہیں۔ ان میں سے ایک تو اصل ایمان واسلام ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی اطاعت کے ذریعہ سے (توسل کیا جائے) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے۔ دوسرا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا اور شفاعت کا وسیلہ پکڑنا (یعنی توسل کرنا)، اور یہ بھی نفع پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی بھی ان دونوں معانی میں سے کسی ایک کا انکار کردے وہ کافر اور مرتد ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دوسری قسم کے توسل سے انکار پہلی قسم کے انکار سے ہلکا کفر ہے۔

چند صفحات چھوڑ کر آگے لکھتے ہیں

فَلَفْظُ التَّوَسُّلِ یُرَادُ بِہٖ ثَلٰثَۃُ مَعَانٍ. اَحَدُھَا التَّوَسُّلُ بِطَاعَتِہٖ فَھٰذَا فَرْضٌ لَا یَتِمُّ الْاِیْمَانُ اِلَّا بِہٖ وَالثَّانِی التَّوَسُّلُ بِدُعَائِہٖ وَشَفَاعَتِہٖ وَھٰذَا کَانَ فِیْ حَیَاتِہٖ وَیَکُوْنُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَتَوَسَّلُوْنَ بِشَفَاعَتِہٖ وَالثَّالِثُ التَّوَسُّلُ بِمَعْنَی الْاِقْسَامِ عَلَی اللّٰہِ بِذَاتِہٖ وَالسُّؤَالُ بِذَاتِہٖ فَھٰذَا ھُوَ الَّذِیْ لَمْ تَکُنِ الصَّحَابَۃُ یَفْعَلُوْنَہٗ فِی الْاِسْتِسْقَاءِ وَنَحْوِہٖ لَا فِیْ حَیَاتِہٖ وَلَا بَعْدَ مَمَاتِہٖ لَا عِنْدَ قَبْرِہٖ وَلَا غَیْرَ قَبْرِہٖ وَلَا یُعْرَفُ ھٰذَا فِیْ شَیْءٍ

یعنی توسل سے تین معنی مراد لئے جاتے ہیں اول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا وسیلہ یہ تو فرض ہے بغیر اس کے ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کا ذریعہ وسیلہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا اور پھر قیامت کے دن سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ذریعہ ڈھونڈیں گے تیسری قسم توسل کی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کی قسم دی جائے یا ان کی ذات مبارکہ کو ذریعہ بنا کر سوال کیا جائے۔ یہ وہ توسل ہے جس کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کبھی نہیں اختیار کیا، نہ استسقاء میں

مِنَ الْاَدْعِيَةِ الْمَشْهُوْرَةِ بَيْنَهُمْ وَاِنَّمَا يُنْقَلُ شَيْءٌ مِّنْ ذٰلِكَ فِيْ اَحَادِيْثَ ضَعِيْفَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ وَّمَوْقُوْفَةٍ اَوْ عَنْ مَّنْ لَيْسَ قَوْلُهٗ حُجَّةً

(قاعدہ جلیلہ ص ۵۰)

وغیرہ) کے لئے نہ کسی اور کام کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، نہ ان کی رحلت کے بعد، نہ ان کی قبر مبارک کے پاس، نہ ان کی قبر کے علاوہ کسی دوسری جگہ۔ اور نہ اس قسم کا توسل مشہور دعاؤں میں پایا جاتا ہے بلکہ اس قسم کے توسل کی تائید میں ضعیف مرفوع اور موقوف احادیث پیش کی جاتی ہیں یا ایسے لوگوں کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں جن کا قول حجت اور دلیل نہیں۔

اور اسی رسالہ ص ۱۰۶ میں لکھتے ہیں۔

وَاَمَّا السُّؤَالُ بِهٖ مِنْ غَيْرِ اِقْسَامٍ بِهٖ فَهٰذَا اَيْضًا مِمَّا مَنَعَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِّنَ الْعُلَمَاءِ وَالسُّنَنُ الصَّحِيْحَةُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخُلَفَائِهِ الرَّاشِدِيْنَ تَدُلُّ عَلٰى ذٰلِكَ۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کے ذریعہ سے سوال کرنا اس طور پر کہ آپ پر قسم نہ بھی دلائی جائے اس کو بھی متعدد علماء نے منع فرمایا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح سنتیں اور خلفاء راشدین کا عمل اس کے منع پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت حافظ رحمہ اللہ تعالیٰ نے جا بجا اس قسم کی عبارات لکھی ہیں اور اُن میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بہت سے علماء نے اس توسل سے منع فرمایا ہے اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ توسل کی یہ قسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد مبارک میں نہیں تھی۔

پہلے دعویٰ کی حمایت میں انہوں نے وہ حدیثیں نقل کی ہیں جو غیر اللہ پر قسم کھانے کی ممانعت میں آئی ہیں۔ یا وہ اقوال جو اللہ کو کسی (غیر اللہ) مخلوق کی قسم دینے کے بارے میں ہیں۔

وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں فقہاء احناف کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ:

وَيُكْرَهُ اَنْ يَّقُوْلَ فِيْ دُعَائِهٖ بِحَقِّ فُلَانٍ وَّبِحَقِّ اَنْبِيَائِكَ وَرُسُلِكَ

یعنی دعا میں یہ کہنا کہ اے اللہ فلاں آدمی کے حق کے ذریعے یا تیرے نبیوں اور رسولوں

اِنَّہٗ اَحَقُّ لِلْمَخْلُوْقِ۔ علیہم السلام کا حق جو تجھ پر ہے اس کے وسیلہ سے میرا یہ کام کر دے (یا میری یہ دعا قبول کرلے)

(الھدایہ ج ۴ ص ۴۷۵)

یہ کہنا مکروہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر، مخلوق کا کوئی حق (واجب) نہیں البتہ جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنی رحمت سے بغیر کسی وجوب کے خاص کر دے یا اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کے لئے کسی چیز کا وعدہ کر لے تو یہ دوسری بات ہے)

کم و بیش اسی طرح کے الفاظ میں یہی مسئلہ خلاصۃ الفتاویٰ جلد ۴ صفحہ ۳۲۶، بحر الرائق جلد ۸ صفحہ ۲۰۷ اور الدر المختار جلد ۵ صفحہ ۲۵۴ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

چار جدا مسئلے

درحقیقت یہاں چار الگ الگ مسائل ہیں۔

(۱) اول تو یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم کھانا مثلاً یوں کہنا کہ فلاں (انسان) کی قسم یا کعبہ کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ بالاتفاق ناجائز اور روحِ توحید کے خلاف ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ کہ کسی مخلوق (یعنی اللہ کے سوا کسی اور) کی قسم اللہ تعالیٰ کو دی جائے اس کو بعض علماء نے جائز لکھا ہے اور ثبوت میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ۔ بہت سے پراگندہ بال والے (پریشان حال) دروازوں سے دھکیلے ہوتے ایسے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کو قسم میں سچا کر دے۔

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ)

لیکن یہ حدیث اُن کے لئے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کی ذات کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ کو قسم دی جائے تو اللہ تعالیٰ اس قسم دینے والے کے سوال کو پورا کر دے گا۔ بلکہ یہاں تو خود انہی کی شخصیت کا حال بیان کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ خود اللہ پر قسم کھا لیویں کہ اللہ کی قسم اللہ ضرور ایسا ایسا کرے گا تو اللہ پاک ان کو قسم میں سچا کر دے گا۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ کہ کسی کے حق کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ

اے اللہ فلاں کا جو حق تجھ پر ہے اس کے وسیلے سے میرا فلاں کام کر دے۔ اس کو بھی ہمارے علماء نے ناجائز لکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی چیز ضروری، لازم یا واجب نہیں۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے کرم و فضل سے کسی کو خاص کر دے یا کسی کیلئے کسی شئے یا ثواب کا وعدہ فرمائے تو یہ ایسا حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف سے مقرر کر رکھا ہے، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق اصلاً ثابت ہے لیکن بعض علماء اس کو جائز کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بعض دعاؤں میں اسی طرح کے الفاظ موجود ہیں (آئندہ انشاء اللہ اس کی مثالیں آئیں گی) اب جو لوگ ایسے الفاظ سے دعا کرنے کو جائز فرماتے ہیں وہ ان الفاظ کو حقیقی معنی میں نہیں لیتے بلکہ اس سے برکت، ثواب جس کا اللہ نے از خود وعدہ کیا ہے حرمت وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ظاہری الفاظ سے حقیقی معانی بھی ذہن اور فہم میں آجاتے ہیں اس لئے یہاں پر بھی منع کو بہتر سمجھا جاتا ہے اور اسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(۴) چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ کسی نیک شخص کے طفیل یا برکت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جائے مثلاً اے اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یا برکت سے میرا فلاں کام کر دے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر متقدمین (پہلے زمانے کے فقہا) نے کوئی خاص بحث نہیں کی ہے۔ اور جو حضرات اس کو منع فرماتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ (توسل) آئمہ متبوعین (یعنی وہ بڑے امام علماء جن کی امت مسلمہ نے پیروی کی ہے) کے ہاں نہیں تھا۔ اور اپنے قول کی تائید میں مذکورہ بالا حنفی فقہاء اور دیگر علمائے کرام کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ حضرات جو اس قسم کے توسل کے قائل ہیں وہ مخالفین کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ متقدمین میں سے کسی نے بھی اس کو منع نہیں فرمایا اور اس بات کی تائید بھی بعض فقہاء سے ظاہر ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ یہی توسل متقدمین فقہاء کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے جیسا کہ حنابلہ کی کتابوں میں ہے۔

وَيَجُوْزُ التَّوَسُّلُ بِالصَّالِحِ وَقِيْلَ — یعنی نیک شخص کے ذریعے توسل جائز ہے اور

يُسْتَحَبُّ قَالَ أَحْمَدُ فِي مَنْسَكِهِ الَّذِي كَتَبَهُ لِلْمَرْوَزِيِّ أَنَّهُ يَتَوَسَّلُ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي دُعَائِهِ وَجَزَمَ بِهِ فِي الْمُسْتَوْعَبِ وَغَيْرِهِ. اهـ

(الفروع ج ۱ ص ۵۹۵ وكذا في الكشاف القناع)

کہا گیا ہے کہ مستحب ہے حضرت امام احمدؒ مناسک حج میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے توسل کیا کریں اور کتب حنابلہ المستوعب وغیرہ میں اس پر تاکید کی گئی ہے۔ اس پر یقین کیا گیا ہے۔

اکثر حنبلی فقہا نے اس قول سے یہی اختلافی توسل ہی مراد لیا ہے۔ البتہ آج کل کے اکثر علمائے حنابلہ کا وہی نظریہ ہے جو حافظ ابن تیمیہؒ کا ہے۔ اور وہ امام احمد رحمہ اللہ کے اس قول کی تاویل کرتے ہیں جیسا کہ حامد فقی نے کشاف القناع پر تعلیق کر کے لکھا ہے۔

يُرِيدُ الْإِمَامُ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ التَّوَسُّلَ بِطَاعَتِهِ وَاتِّبَاعِ هَدْيِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا التَّوَسُّلَ بِجَاهِهِ۔

یعنی امام احمد رضی اللہ عنہ کی مراد یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع واطاعت کرنے کے ذریعے توسل کرنا ہے نہ کہ ان کی جاہ ومرتبہ کے ذریعہ سے۔

لیکن حامد فقی نے امام احمدؒ کے قول کی جو تاویل کی ہے وہ حقیقت سے دور معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت امامؒ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ توسل کیا کریں۔

اسی طرح امام شافعیؒ کے بارے میں تاریخ خطیب میں ہے جس کو عقود الجمان میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ:

رَوَى الْقَاضِي أَبُو عَبْدِ اللهِ الصَّيْمَرِيُّ وَالْخَطِيبُ عَنْ عَلِيِّ بْنِ مَيْمُونٍ قَالَ سَمِعْتُ الشَّافِعِيَّ يَقُولُ إِنِّي لَأَتَبَرَّكُ بِأَبِي حَنِيفَةَ (عقود الجمان ص ۳۶۳)

قاضی ابوعبداللہؒ اور خطیب بغدادیؒ علی بن میمون سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام شافعیؒ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ میں امام ابوحنیفہؒ کے ذریعے سے تبرک حاصل کرتا ہوں۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی طرح دیگر متقدمین فقہائے کرام کے اور اقوال بھی موجود ہیں جن سے ثابت کیا جاتا ہے کہ توسل کی یہ قسم ان کے یہاں مروج تھی اور انہوں نے اسے منع نہیں فرمایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ متقدمین علماء نے اس قسم کے توسل پر کوئی واضح بحث نہیں کی ہے، جس سے اس مسئلہ کی صحیح اور صاف نشاندہی ہو سکے، متاخرین (بعد کے دور میں آنے والے علماء) کے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہی مسئلہ سلف صالحین میں موجود تھا؛ وہ ثبوت میں بعض احادیث اور ایسے قرائن مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر سلام کرنا یا وہاں جاکر دعا کی درخواست کرنا وغیرہ پیش کرتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ سے بھی کچھ اشعار اس بارے میں نقل کئے گئے ہیں، لیکن اشعار کا اعتبار اس مسئلہ میں اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر وہ غلبہ حال و محبت، اظہار شوق یا جدائی کے غم کی وجہ سے ہوسکتے ہیں۔

اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ توسل کی یہ قسم متقدمین اور آئمہ کے ہاں نہیں تھی وہ عدم جواز پر متقدمین کے ایسے اقوال پیش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی قسم دینے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) لہ عقود الجمان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان للمؤرخ الکبیر الشیخ الاسلام محمد بن یوسف الصالحی الدمشقی الشافعی۔ مکتبۃ الایمان السمانیہ۔ المدینۃ المنورہ

لہ اس قسم کی روایات کا تعلق مسئلہ استشفاع سے ہے۔

لہ یہی حال ان غائبانہ خطابوں کا ہے جو بعض صادق زبانوں سے نکلی ہیں مثلاً یا رسول اللہ، یا محمد، واہ محمد وغیرہ، یہ سب کچھ اظہار محبت یا حسرت وغیرہ میں ہوا کرتے ہیں، جیسے مشفق ماں اپنے بچے کی وفات کے بعد اس کا نام پکارتی ہے، شعراء اپنے اشعار میں پہاڑوں، جنگلوں، ہواؤں وغیرہ کو مخاطب ہوتے ہیں، عشاق اپنے محبوبوں کو غائبانہ پکارتے ہیں، حالانکہ یہاں کسی خطاب اور پکارسے واقعۃً ندا، پکار مقصود نہیں ہوتی، اور نہ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ (یعنی جسے پکارا جاتا ہے) میری پکار کو سن رہا ہے، بلکہ یہ تو ایسی خطاب و پکار ہوا کرتی ہے جو عشق و محبت یا حسرت وغیرہ کی وجہ سے زبانوں پر جاری ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی ندا و پکار پر نہ تو واقعاتی احکام جاری ہوسکتے ہیں اور نہ ہی ایسے خطابوں سے غائبانہ استشفاع اور توسل پر استدلال کرنا صحیح معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔

کے بارے میں ہیں یا مخلوق کے حق کے ذریعہ سے دُعا مانگنے کی ممانعت پر وارد ہوتے ہیں۔ حالانکہ متقدمین علماء نے ممانعت کی وجہ بھی صاف بیان فرمائی ہے تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا حق ثابت ہے۔ ان کا قول واضح ہے اِنَّہٗ لَا حَقَّ لِمَخْلُوْقٍ عَلَی اللّٰہِ تَعَالٰی۔ اللہ تعالیٰ پر کسی مخلوق کا کوئی حق نہیں۔ اب توسل کی اس قسم کو ناجائز کہنے والے حضرات درحقیقت مختلف مسائل کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ اور فی الحقیقت متقدمین کے بعض افعال و اقوال اسی توسل کے جائز ہونے کی تائید کرتے ہیں (جیساکہ اوپر گزر چکا، حضرات امام احمدؒ و امام شافعیؒ وغیرہ کے بارے میں)

اسی طرح متاخرین علماء کی اکثریت نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے بعض نے اس پر مستقل رسالے لکھے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض علمائے احناف (جو کہ شرک و بدعت کے معاملہ میں نہایت حساس واقع ہوتے ہیں انھوں) نے بھی اس کے جواز پر تصریح کی ہے جیساکہ ملا علی قاری اپنی آخری تصنیف "شرح النقایہ" میں لکھتے ہیں۔

قِیْلَ وَیَحْرُمُ اَنْ یَّقُوْلَ فِیْ دُعَائِہٖ بِحَقِّ فُلَانٍ نَبِیًّا کَانَ اَوْ وَلِیًّا اَوْ بِحَقِّ الْبَیْتِ اَوِ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ اِذْ لَا حَقَّ لِلْخَلْقِ عَلَی اللّٰہِ لٰکِنْ قَدْ یُقَالُ اِنَّہٗ لَا حَقَّ لَھُمْ وُجُوْبًا مِنْ اَصْلِہٖ لٰکِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ لَھُمْ حَقًّا فَضْلًا اَوْ یُرَادُ بِالْحَقِّ الْحُرْمَۃُ وَالْعَظَمَۃُ فَیَکُوْنُ مِنْ بَابِ الْوَسِیْلَۃِ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَقَدْ عُدَّ مِنْ آدَابِ الدُّعَاءِ التَّوَسُّلُ بِالْاَنْبِیَاءِ وَالْاَوْلِیَاءِ عَلٰی مَا فِی الْحِصْنِ الْحَصِیْنِ جَاءَ فِیْ رِوَایَۃٍ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ

کہا گیا ہے کہ بحق فلاں چاہے نبی ہو یا ولی اللہ یا بحق بیت اللہ یا بحق مشعر الحرام دعا میں کہنا حرام ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی حق اللہ پر نہیں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا کوئی حق واجب نہیں سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حق اور فضل مقرر کر دیا ہے یا اس سے مراد ان کی حرمت اور عظمت کے ذریعہ سے سوال کرنا ہے۔ پس یہ وسیلہ کے باب (دائرہ) میں ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وسیلہ ڈھونڈو۔ اور انبیاء اور اولیاء کے ذریعہ سے التوسل کرنا دعا کے آداب

أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَايَ إِلَيْكَ فَإِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشَرًا وَلَا بَطَرًا وَلَا رِيَاءً وَلَا سُمْعَةً .... الحدیث	میں سے ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس حق کے ذریعہ سے جو سائلین (مانگنے والوں) کا تجھ پر بنتا ہے اور سوال کرتا ہوں اس حق کے ذریعے
(شرح النقایہ ج ۲ ص ۱۹۶ وفی الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص ۱۹۹)	جو تیری رضا کے لئے میرے چلنے کی وجہ سے (تجھ پر ہے) پس میں نہیں نکلا ہرگز نہیں نکلا فخر کی وجہ سے اور نہ تکبر کی وجہ سے۔

اور علامہ کشمیری رحمہ اللہ کو اس مسئلہ میں کچھ تردد ہے، وہ فرماتے ہیں۔

وَهٰذَا النَّحْوُ جَائِزٌ عِنْدَ الْمُتَأَخِّرِيْنَ وَمَنَعَ عَنْهُ الْحَافِظُ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِبْنُ تَيْمِيَّةَ وَإِنِّي مُتَرَدِّدٌ فِيْهِ لِأَنَّهُ أَتٰى بِعِبَارَةٍ عَنِ الْإِمَامِ مِنْ تَجْرِيْدِ الْقُدُوْرِيِّ إِنَّ الْإِقْسَامَ عَلَى اللّٰهِ بِغَيْرِ أَسْمَائِهِ لَا يَجُوْزُ فَتَمَسَّكَ بِنَفْيِ الْإِقْسَامِ عَلٰى نَفْيِ التَّوَسُّلِ فَإِنْ كَانَ التَّوَسُّلُ إِقْسَامًا فَالْمَسْأَلَةُ كَمَا ذَهَبَ إِلَيْهِ ابْنُ تَيْمِيَّةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَإِنْ لَمْ يَكُنْ إِقْسَامًا فَيَنْبَغِيْ جَوَازُهٗ - اھ فیض الباری ص ۳۷۹ ج ۲)	یہ توسل متاخرین کے نزدیک جائز ہے اور حافظ ابن تیمیہ نے اس سے منع فرمایا ہے، میں خود اس میں متردد ہوں، کیونکہ ابن تیمیہؒ نے حضرت امام (ابوحنیفہؒ) کا قول تجرید قدوری سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے مبارک کے بغیر (یکارنے) کسی (مخلوق کی) قسم دینا جائز نہیں پس حافظ نے اللہ تعالیٰ کو قسم دینے کی ممانعت کو بنیاد بنا کر توسل کی نفی کی ہے، پس اگر توسل (کا مطلب) اللہ تعالیٰ کو قسم دینا ہے، پھر تو مسئلہ ایسا ہی ہے جیسے کہ حضرت حافظ فرماتے ہیں،

اور اگر توسل اللہ تعالیٰ کو قسم دینا نہیں پھر مسئلہ جائز باقی رہتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں، ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو جو اندھا تھا ان کلمات سے تعلیم دی، اے اللہ تیرے سامنے تیرے نبی محمد کے وسیلہ سے جو نبی رحمت ہے التجا کرتا ہوں پھر آگے (اعرابی نے) عرض کیا، اے اللہ تو ان (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش کو میرے

حق میں قبول فرما فَثَبَتَ مِنْهُ التَّوَسُّلُ الْقَوْلِيُّ اَيْضًا وَحِيْنَئِذٍ اِنْكَارُ الْحَافِظِ اِبْنِ تَيْمِيَةَ تَطَاوُلٌ ”تو اس سے قولی توسل بھی ثابت ہو گیا لہٰذا حافظ ابن تیمیہؒ کا اس سے انکار زیادتی ہے (فیض الباری ج ۴ ص ۴۳۸)۔

یہاں علامہ آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ ایسے مسائل میں ابن تیمیہؒ اور اُن کے شاگردوں سے ملتا جلتا ہے۔ وہ ان مسائل پر گہری تحقیق کرتے ہوئے توسل کی اس نوع کے بارے میں لکھتے ہیں۔

وبعد هذا كله انا لا ارى باسا في التوسل الى الله تعالى بجاه النبي صلى الله تعالى عليه وسلم عند الله تعالى حيا وميتا ويراد من الجاه معنى يرجع الى صفة من صفاته تعالى، مثل ان يراد به المحبة التامة المستدعية عدم رده وقبول شفاعته، فيكون معنى قول القائل: إلهي اتوسل بجاه نبيك صلى الله تعالى عليه وسلم ان تقضي لي حاجتي، إلهي اجعل محبتك له وسيلة في قضاء حاجتي، ولا فرق بين هذا وقولك: إلهي اتوسل برحمتك ان تفعل كذا، اذ معناه ايضا إلهي اجعل رحمتك وسيلة في فعل كذا، بل لا ارى باسا ايضا بالاقسام على الله تعالى بجاهه صلى الله تعالى عليه وسلم بهذا المعنى والكلام في الحرمة كالكلام في الجاه، ولا يجري ذلك في التوسل والاقسام بالذات البحت، نعم لم يعهد التوسل بالجاه والحرمة عن احد من الصحابة رضي الله تعالى عنهم، ولعل ذلك كان تحاشيا منهم عما يخشى ان يعلق منه في اذهان الناس اذ ذاك، وهم قريبو عهد بالتوسل بالاصنام شيء ثم اقتدى بهم من خلفهم من الائمة الطاهرين، وقد ترك رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم هدم الكعبة وتاسيسها على قواعد ابراهيم لكون القوم حديثي عهد بكفر كما ثبت ذلك في الصحيح، وهذا الذي ذكرته انما هو لدفع الحرج عن الناس والفرار من دعوى تضليلهم كما يزعمه البعض في التوسل بجاه عريض الجاه صلى الله تعالى عليه وسلم لا للميل الى ان الدعاء كذلك افضل من استعمال الادعية المأثورة التي جاء بها الكتاب وصحت بها السنة السنية، فانه لا يستريب منصف في

ان ما علمه اللہ تعالیٰ، ورسوله صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم و علیه الصحابة الکرام رضی اللہ تعالیٰ عنهم، وتلقاه من بعدهم بالقبول افضل واجمع وانفع واسلم فقد قیل ما قیل ان حقا وان کذبا ربقی ههنا امران) الاول ان التوسل بجاه غیر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیه وسلم لا باس به ایضا ان کان المتوسل بجاهه مما علم ان له جاها عند اللہ تعالیٰ کالمقطوع بصلاحه وولایته واما من لا تقطع فی حقه بذلک فلا یتوسل بجاهه لما فیه من الحکم الضمنی علی اللہ تعالیٰ بما لم یعلم تحققه منه عز شانه، وفی ذلک جرأة عظیمة علی اللہ تعالیٰ. الثانی ان الناس قد اکثروا من دعاء غیر اللہ تعالیٰ من الاولیاء الاحیاء منهم والاموات وغیرهم، مثل یا سیدی فلان اغثنی، ولیس ذلک من التوسل المباح فی شیٔ، واللائق بحال المؤمن عدم التفوه بذلک وان لا یحوم حول حماه وقد عده اناس من العلماء شرکا وان لا یکنه، فهو قریب منه ولا اری احدا ممن یقول ذلک الا وهو یعتقد ان المدعو الحی الغائب او المیت المغیب یعلم الغیب او یسمع النداء ویقدر بالذات او بالغیر علی جلب الخیر ودفع الاذی والا لما دعاه ولا فتح فاه، وفی ذلک بلاء من ربکم عظیم فالحزم التجنب عن ذلک وعدم الطلب الا من اللہ تعالیٰ القوی الغنی الفعال لما یرید۔

یعنی اس تمام تر بحث کے بعد بھی مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جاہ پر توسل الی اللہ میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، چاہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حالت میں ہو، یا رحلت فرمانے کے بعد ہو، اور جاہ سے کوئی ایسا معنی مراد لیا جاتے گا، جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف راجع ہو، مثلاً اس سے مراد یہ ہو کہ ایسی پکی اور سچی محبت جو عدم رد اور قبول شفاعت کا تقاضا کرتی ہو، پس اس صورت میں قائل کے اس قول، اے میرے اللہ میں توسل کرتا ہوں آپ کے نبی کی جاہ پر کہ آپ میری حاجت پوری کریں، کا مطلب یہ ہو گا، اے میرے مولا! تجھے جو محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے، اس محبت، کو میری حاجت پوری کرنے کا وسیلہ بنا دیں، پس اس قول میں اور آپ کے اس قول میں کوئی فرق نہیں، کہ اے اللہ میں توسل کرتا ہوں

آپ کی رحمت پر کہ آپ ایسا کر دیجئے۔ کیونکہ اس کا مفہوم بھی یہ بنتا ہے۔ اے اللہ اپنی رحمت کو (میرے لئے) وسیلہ بنا دے۔ اس عمل میں بلکہ (میرے نزدیک) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جاہ پر اللہ کو قسم دینے میں بھی مضائقہ نہیں۔ اگر یہی (پہلے بیان کردہ) معنی اختیار کئے جائیں۔ اور (آپ کی) حرمت کے ذریعہ سے مانگنے میں ایسا ہی کلام ہے جیسا کہ جاہ کے ذریعہ سے مانگنے میں۔ اور اس جواز کو صرف ذات ہی پر توسل اور اقسام میں نہیں جاری کیا جائے گا۔ البتہ یہ ہے کہ توسل بالجاہ کسی صحابی سے مروی نہیں اور شاید انہوں نے یہ توسل اس لئے نہیں کیا ہو کہ شرک سے حفاظت ہو۔ کیونکہ اس وقت یہ ڈر تھا کہ یہ چیز اُن کے اذہان میں پیوست نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ وہ اس وقت بتوں پر توسل کے زمانے سے کچھ قریب تھے۔ پھر آنے والے ائمہ صالحین نے ان کی اقتدی کی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو گرانے اور اس کو دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرز اور بنیاد پر بنانے (کے خیال) کو ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کی قوم زمانہ کفر کے قریب تھی۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اور میں نے جو جواز ذکر کیا ہے۔ (صرف) اس لئے کہ اس میں لوگوں سے حرج دفع ہو جاتے۔ اور توسل کرنے والوں کی طرف گمراہی کی نسبت کرنے سے بچایا جائے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند ہستی پر توسل کرنے کے بارے میں (یہ غلط) گمان ہے (کہ ان پر توسل کرنے والے گمراہ ہیں) اور میں نے جو یہ راہ اختیار کی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ میرا میلان اسی طرف ہے کہ اس طرح (توسل بالجاہ سے) دُعا مانگنا ان دعاؤں سے افضل ہے جو ماثورہ ہیں اور قرآن میں آئی ہیں۔ اور سنت (مبارک) کی زبان سے صراحت کے ساتھ نکلی ہیں (کیونکہ اس بات میں کوئی منصف شک نہیں کرے گا کہ جو چیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے تعلیم کی ہے جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا ہے اور بعد والوں نے اس کو قبول کیا ہے وہ افضل ہے اور بہت (کامل) پوری ہے اور انفع ہے اور اسلم ہے۔ اور (ہر قسم کے) غل وغش سے محفوظ (پاک) ہے۔

اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوتے آگے لکھتے ہیں۔

یہاں دو باتیں باقی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کی جاہ کے ذریعہ پر بھی دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ جس کی جاہ پر توسل کیا جاتا ہے وہ ایسے لوگوں میں سے ہو جس کی جاہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثابت ہو۔ جیسے کوئی یقینی طور پر صالح اور ولی اللہ ہو مثلاً انبیا۔ علیہم السلام اور وہ لوگ جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر بتایا ہو مثلاً عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ اور جس کے بارے میں ولی اور صالح ہونا ثابت نہیں تو اس کی جاہ پر توسل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ پر ایسا حکم لگانا ہے جس کے بارے میں حق تعالیٰ و تبارک کی طرف سے کوئی (ایسی) تحقیقی بات نہیں معلوم اس میں اللہ پر ایک عظیم جرأت کرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے لوگوں نے غیر اللہ سے مانگنے میں بہت کثرت کی یعنی زندہ یا مُردہ اولیا۔ سے مثلاً یوں کہتے ہیں اے فلاں میری مدد کر! اور یہ مباح توسل میں سے نہیں ہے اور مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ اس میں نہ پڑے۔ اور وہ شرک کی حدود کے قریب (بھی) نہ جائے۔ اور اس کو علما۔ نے شرک میں سے شمار کیا ہے اور (اگر) یہ شرک نہیں ہے تو اس کے قریب ہے۔ اور میں نہیں دیکھتا کسی کو جو یہ ایسی باتیں کہ اے فلاں میری مدد کر! کہتا ہو مگر وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جس کو وہ پکار رہا ہے (چاہے) وہ زندہ ہے یا مُردہ) وہ غیب کو جانتا ہے۔ اور ہماری ندا کو سنتا ہے۔ اور بذات خود قدرت رکھتا ہے اپنی ذات پر بھی اور غیر پر بھی کہ خیر کو حاصل کرے اور مصیبت کو دفع کرے۔ اگر یہ (اس کا عقیدہ) نہ ہو تو وہ (دعا مانگنے والا) اس سے دُعا نہ مانگتا اور نہ دُعا کے لئے منہ کھولتا۔ اور اس (غلط) طرز عمل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم آزمائش ہے۔ پس یقینی بات یہ ہے کہ اس سے پرہیز کرنا اور اس رب۔ اللہ تعالیٰ و تبارک سے مانگنا چاہیئے جو کہ قوی اور غنی ہے۔ اور وہ کرنے والا ہے اس چیز کو جو وہ چاہے وہ فعال لما یرید ہے۔

حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دوسری بات یہ کہی تھی کہ یہ توسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یا جاہ کے ذریعہ سے سوال کرنا، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس توسل کو اختیار کیا تھا گویا ان کے نزدیک یہ بدعت ہے۔

اس پر وہ حضرت عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے واقعات سے استدلال کرتے ہیں جیسا کہ بخاری شریف ابواب الاستسقاء میں ہے۔

(۱) عن انس بن مالکؓ ان عمر ابن خطابؓ کان اذا قحطوا استسقیٰ بالعباسؓ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ فقال اللّٰھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون

(بخاری ج ۱ ص ۱۳۷)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوجاتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کرتے۔ اور کہتے اے اللہ ہم تیرے پاس تیرے نبی کا وسیلہ لے کر آیا کرتے تھے تو تو ہمیں سیراب کیا کرتا تھا اب ہم لوگ اپنے نبی کے چچا یعنی حضرت عباسؓ رضی اللہ عنہ کا وسیلہ لے کر آتے ہیں، ہمیں سیراب کر

(راوی کہتے ہیں، پھر وہ لوگ سیراب کئے جاتے (یعنی بارش ہوجاتی)

(۲) اسی طرح شام میں جب لوگوں پر قحط پڑا تو معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید بن اسود قرشی رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی وہ کہتے تھے اللّٰھم نستشفع او نتوسل بخیارنا۔ اے اللہ ہم شفاعت طلب کرتے ہیں یا وسیلہ اختیار کرتے ہیں ان لوگوں کا جو ہم میں سے بہترین (سب سے زیادہ نیک) ہیں

پھر اس کے بعد فرمایا۔

یا یزید ارفع یدیک فرفع یدیہ ودعا ودعا الناس حتیٰ سقوا۔

اے یزید ہاتھ اٹھا (یعنی دعا کر) تو انہوں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی اور لوگوں نے (بھی) دعا کی حتیٰ کہ وہ سیراب کئے گئے۔

ان حدیثوں کے پیش نظر حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے ہم خیال حضرات کی بحث کا

خلاصہ یہ ہے کہ :-

اگر وفات کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے وسیلہ سے دعا مانگنی جائز ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی آپ کو نظر انداز نہ کرتے ، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مجمع میں آپ کا وسیلہ چھوڑ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ کبھی اختیار نہ کرتے - اسی طرح ان کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ چھوڑ کر یزید بن اسود رضی اللہ عنہ کا وسیلہ اختیار کیا - تو یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ کسی بھی مخلوق کی ذات کو توسل کا ذریعہ بنانا جائز نہیں چاہے وہ زندہ ہو یا مُردہ - کیونکہ یہاں بھی حضرت عباسؓ کی ذات کو ذریعہ نہیں بنایا گیا اور نتوسل الیک بعم نبینا سے مراد نتوسل الیک بدعاء عم نبینا ہے یعنی ہم لوگ اپنے نبی کے چچا کی دعا کا وسیلہ لے کر آتے ہیں - یہاں ان سے دعا کروانا مقصود تھا نہ کہ ان کی ذات پر توسل کرنا -

اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ یہاں یہ دعویٰ کرنا کہ لفظ دعاء جو مضاف ہے عم یعنی چچا کی طرف ، کو حذف کیا گیا ہے - غلط ہے - یہ محض ان کے ذہن کی ایجاد ہے حدیث شریف اس سے پاک ہے - اس حدیث میں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ذات کو وسیلہ اور واسطہ بنا کر حضرت عمرؓ کا دعا مانگنا ثابت ہوتا ہے اور منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ذہن کی ایجاد نہیں بلکہ ان ہی روایات میں اس کا قرینہ موجود ہے - وہ یہ کہ پھر ان ہی حضرات سے دعا کروائی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں توسل سے مراد صرف ان سے دعا کروانی تھی - نہ کہ ان کی ذات پر توسل کرنا - اور قائلین توسل کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے یزید بن اسودؓ پر توسل کرنے کے بعد انہی سے دعا کروائی - اسی طرح بعض روایات میں حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی یہ آتا ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے دعا مانگی اور پھر انہی درخواست پر حضرت عباسؓ نے بھی دعا کی - جس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک نیک آدمی دوسرے نیک آدمی سے دعا کے لئے گزارش کر سکتا ہے - اگرچہ وہ اس سے درجہ میں کم

ہو، بڑے یا چھوٹے ہونے کا فرق نہیں۔ حدیث ابی صالحؒ میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ منبر پر رونق افروز ہوتے تو ساتھ ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما ہوتے۔ پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعا کی۔

اللھم انا توجھنا الیک بعم نبیک وصنو ابیہ فاسقنا الغیث ولا تجعلنا من القانطین۔

اے اللہ ہم تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور ان کے باپ کی نسل کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہم پر رحمت کر بارش برسا اور ہمیں مایوس نہ فرما۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قل یا ابا الفضل کہ آپ بھی کچھ فرمائیے اے ابوفضل۔ تو انہوں نے یوں دعا کی جس کا مفہوم یہ ہے۔

اللھم لم ینزل بلاء الا بذنب ولم یکشف الا بتوبۃ وقد توجہ بی القوم الیک با لذنوب ونواصینا با لتوبۃ فاسقنا الغیث۔

اے اللہ مصائب کا نزول گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ مصائب توبہ ہی سے دور ہوتے ہیں تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجھے جو تعلق، عزت و منزلت حاصل ہے اس کے سبب قوم نے مجھے آپ کے حضور میں وسیلہ بنایا ہے ہم اپنے گناہ آلود ہاتھ پھیلاتے حاضر ہیں اور توبہ و ندامت سے سر جھکاتے ہیں پس ہم پر رحمت کی بارش برسا۔

اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عباسؓ پر توسل کے ساتھ ساتھ ان سے دعا کروانا بھی مقصود تھا۔

اور علامۃ الزرقانی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے فاتخذ وہ (یعنی العباس) وسیلۃ الی اللہ۔ یعنی حضرت عباسؓ کو اللہ تعالیٰ کے لئے وسیلہ پکڑو، بلکہ الاستیعاب میں ابن عبد البرؒ نے استسقاء عمر رضی اللہ عنہ کا سبب بھی بیان کیا ہے۔

کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مجلۃ (رمادہ) میں بہت سخت قحط پڑ گیا۔ فقال

کعبؓ یا امیر المومنین ان بنی اسرائیل کانوا اذا اصابھم مثل ھذا استسقوا بعصبۃ الانبیاء فقال عمرؓ ھذا عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصنو ابیہ وسید بنی ھاشم فمشی الیہ عمرؓ وشکا الیہ۔ تو حضرت کعبؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے امیر المومنین جب بنی اسرائیل ایسی مصیبت میں مبتلا ہوتے تو انبیاء علیہم السلام کی جماعت کے ذریعے توسل کرتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور مثل باپ ہیں۔ اور بنی ہاشم کے سردار ہیں۔ پس اُن کے پاس چلے گئے اور اُس قحط کی شکایت کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توسل بالذات ہے جو کہ قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔

جب توسل بالذات ثابت ہو جاتا ہے تو اس حدیث کی وجہ سے جوازِ توسل کو صرف زندوں کے ساتھ خاص کرنا بھی صحیح نہیں کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ زندہ شخصیت پر توسل تو اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نیک اور مقرب و مقبول بندہ ہے۔ اگر وہ وفات پا جاتا ہے تو موت کے ساتھ اس کی نیکی اور مقبولیت تو زائل نہیں ہو جاتی کہ ان کے مرنے کے بعد توسل کو لغو یا ناجائز قرار دیا جائے۔

پس حضرت عباسؓ کے واسطہ سے دُعا کرنے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے توسل صحابہؓ کے ہاں ناجائز تھا۔ اور نہ ہی انہوں نے وضاحت کی ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کا وسیلہ اختیار کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے مجبوراً آپ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا۔ بلکہ حدیث میں یہ جملہ قابل غور ہے۔ "انا نتوسل الیک بعم نبینا۔ ہم تیرے حضور میں اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ لے کر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ہم تیرے حضور میں عباس بن عبد المطلب یعنی عباس جو بیٹا عبد المطلب کا ہے کا وسیلہ لے کر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے اس میں بھی دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو وسیلہ بنایا گیا؟

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا اظہار کیا گیا ہے، بلکہ اس حدیث مبارک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ توسل، زیادہ نیک آدمی یا فاضل کی موجودگی میں بھی ایک کم درجہ کے نیک آدمی یا مفضول کے ذریعے بھی جائز ہے، جیسا کہ کسی سے دعا کی درخواست کرنا، فاضل اور مفضول دونوں سے جائز ہے۔

اور اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایات سے تو صاف ظاہر یہ ہے کہ مقصود ان حضرات کا حضرت عباسؓ اور حضرت یزید بن اسودؓ کے وسیلہ اور ذریعہ اللہ تعالیٰ سے بارش کی درخواست کرنی تھی، اور اس کے لئے انھی حضرات سے دعا کروانی تھی۔ رہا کسی ذات پر توسل کرنا تو ان روایات میں اس کا ثبوت کم احتمال ہے، غرض مذکورہ بالا روایات میں قائلین اور مانعین دونوں کے لئے بحث مباحثہ کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اور جو لوگ توسل کا انکار کرتے ہیں وہ طبرانی وغیرہ کی ایک حدیث سے اس کے منع پر استدلال کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

ایک منافق مسلمانوں کو تکلیف پہنچایا کرتا تھا، تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، قوموا نستغیث برسول اللہ من ھذا المنافق فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ لا یستغاث بی وانما یستغاث باللہ، چلو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس منافق کے خلاف فریاد لے جائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فریاد مجھ سے نہیں کی جاتی، فریاد تو خاص اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے۔

اس حدیث کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، اگر اس کو مانا

لہ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب بھی قحط ہوتا اس کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر استسقاء (بارش مانگنے کی دعا کرنا) اور ان کو وہاں حاضر کرنا، اللہ تعالیٰ کا بارش کے بارے میں انھی سے دعا کروانا تو یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا توسل حضرت عباسؓ پر یہ تھا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرواتے تھے، نہ ان کی ذات کو وسیلہ بنا کر خود اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرتے کہ اللہ آپ کے چچا کے طفیل ہم پر بارش نازل فرمائے۔

بھی جلتے تو اس کا صحیح مفہوم اور تفصیل ایک دوسری حدیث شریف سے معلوم کیا جاسکتا ہے جیسا کہ سنن ابی داؤد میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا، جانیں مشقت میں ڈال دی گئی ہیں اور اہل وعیال بھوکے ہیں، اموال میں نقصان پڑ گیا ہے اور مویشی ہلاک ہوگئے ہیں۔

فاستسق اللہ لنا فانا نستشفع بک علی اللہ ونستشفع باللہ علیک فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم سبحان اللہ سبحان اللہ فما زال یسبح حتی عرف ذلک فی وجوہ اصحابہ ثم قال ویحک انہ لا یستشفع باللہ علی احد شان اللہ اعظم من ذلک (رواہ ابوداؤد مشکوۃ باب بدء الخلق)۔

سو آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں، ہم آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے شفاعت طلب کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذریعہ آپ سے شفاعت طلب کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ سبحان اللہ آپ دیر تک تسبیح پڑھتے رہے یہاں تک کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے چہروں پر اس اعرابی کے لئے غضب کے آثار ظاہر ہوگئے، پھر آپ نے فرمایا تیری حالت پر افسوس، اللہ تعالیٰ کو ذریعہ بنا کر کسی سے شفاعت نہیں کی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بڑی ہے۔

اب یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کے اس قول نستشفع باللہ علیک (یعنی ہم اللہ کو ذریعہ بناتے ہیں آپ کے پاس شفاعت کا) کی تو تردید کی اور منع فرمایا لیکن اس کے پہلے قول انا نستشفع بک علی اللہ (کہ ہم آپ کو ذریعہ بناتے ہیں اللہ کے ہاں شفاعت کا) پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔ اور اس قول کو جواز پر ہی برقرار رکھ دیا گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی حدیث شریف کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ذریعہ بنا کر کسی مخلوق سے فریاد یا شفاعت نہیں طلب کی جاتی، لیکن مخلوق کو ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے توسل اور شفاعت جائز ہے۔

لیکن اس کا جواب منکرین توسل یہ دیتے ہیں کہ مخلوق پر توسل اور ان سے سفارش کروانے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو ان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی

درخواست کی جائے نہ کہ اس کی شخصیت پر توسل کرنا۔

قائلین توسل کے دلائل

الغرض جن احادیث سے حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے ہم خیال متنازع فیہ توسل کے منع پر استدلال کرتے ہیں انہی روایات اور متقدمین کے اقوال سے ان کے مخالفین اس کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ توسل کے قائلین قرآن مجید کی آیات، احادیث اور آثار بھی جواز میں پیش کرتے ہیں، جن میں سے چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

(سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۸۹)

اور جب آئی ان کے پاس کتاب (قرآن مجید) جو تصدیق کرتی ہے اس (کتاب تورات) کی جو ان کے پاس ہے اور وہ اس سے قبل (اس کی برکت سے) کافروں پر فتح مانگتے تھے تو پھر جب ان کے پاس وہ نبی آئے جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے، سو پھٹکار ہو کفر کرنے والوں پر۔

یہاں یہود کے دانستہ کفر اور تعصب کی ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ تورات اور انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بشارتیں موجود تھیں، ان کی وجہ سے یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا شدید انتظار کر رہے تھے۔ اور اپنے دینی و دنیاوی مقاصد میں کامیابی اور اپنے مخالفین پر فتح مندی کو آپ کی بعثت پر منحصر سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ سے جس طرح فتح طلب کرتے تھے اس کے بارے میں مختلف اسباب نزول آئے ہیں، ان میں سے دو کو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں باقی شان نزول سے زیادہ قوی ہیں۔ پہلی شان نزول علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہؒ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے اوس اور خزرج کے مشرکین پر اللہ تعالیٰ سے فتح مانگتے تھے جیسا کہ سدی سے روایت ہے کہ جب ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ سخت ہو جاتی اور فتح کی کوئی

ظاہری صورت نہ رہتی تو اس وقت تورات کو سامنے رکھ کر کھولتے اور ان مقامات پر ہاتھ رکھ کر دعا کرتے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور کمالات کا ذکر ہوتا دُعا یوں کرتے۔

اللھم انا نسئلک بحق نبیک الذی وعدتنا ان تبعثہ فی آخر الزمان ان تنصرنا الیوم علی عدونا فینصرون

(روح المعانی برا لطبع بلاق مصر)

اے اللہ ہم تجھ سے تیرے اس نبی کے حق (یعنی حرمت اور طفیل سے) سے سوال کرتے ہیں، جس کی بعثت کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ آج تو ہمیں اپنے دشمن پر فتح دے، پس ان کی مدد کی جاتی

حاکمؒ اور بیہقیؒ نے ایک ضعیف سند سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے جس میں ہے کہ خیبر کے یہود دشمن کے مقابلے میں اس طرح دُعا کرتے تھے۔

اللھم انا نسئلک بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر الزمان۔

اے اللہ ہم تجھ سے اُمّی نبی محمد کے حق (یعنی حرمت طفیل سے) سے سوال کرتے ہیں، وہ نبی جس کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ تو اس کو ہمارے لئے آخری زمانہ میں مبعوث فرمائے گا۔

اس کے علاوہ تفسیر کبیر میں علامہ رازیؒ نے اس آیت کی شان نزول میں پانچ وجوہ تحریر کی ہیں، ان میں سے دو ایسی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہود کا توسل کرنا ثابت ہوتا ہے، اور تفسیر ابن کثیر میں بھی اس کے قریب قریب روایت نقل کی گئی ہے۔ اگرچہ ان کے نزدیک ترجیح دوسری روایت کو معلوم ہوتی ہے، اسی طرح تفسیر علامہ ابی مسعودؒ اور امام السیوطیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں کچھ ایسی روایتیں جمع کی ہیں جن میں بعض سے توسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔

(دیکھئے الدر المنثور ج ۱ ص ۸۸)

دوسری وجہ سبب نزول میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اہل کتاب اپنی ترقی اور فتحمندی کا انحصار آپ کی بعثت اور تشریف آوری پر سمجھتے تھے اور مشرکین عرب سے کہتے تھے

کہ عنقریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تم کو ختم کر ڈالیں گے، جیسا کہ تفسیر ابن کثیرؒ میں اس کو قتادہؒ سے نقل کیا گیا ہے اور ابوالعالیہ رحمہ اللہ سے بھی اس کی یہی تفسیر منقول ہے کہ:۔

کانت الیھود تستنصر بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم علی مشرکی العرب فیقولون اللھم ابعث ھذا النبی الذی نجدہ مکتوبا عندنا حتی تعذب المشرکین وتقتلھم۔

یہود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مشرکین عرب کے مقابلہ میں نصرت طلب کرتے تھے کہتے تھے اے اللہ بھیج یہ نبی جس کا ذکر ہم توراۃ و انجیل میں اپنے پاس لکھا ہوا پاتے ہیں تاکہ ہم مشرکین کو عذاب دیں، اور ان کو قتل کر دیں۔

(ابن کثیر ج ۱ ص ۱۲۴)

اسی طرح تھوڑے سے فرق کے ساتھ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت منقول ہے۔

الغرض اہل کتاب کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فتح و نصرت طلب کرنے کا مطلب، ان روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آپ عنقریب دنیا میں تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ ہو کر مشرکین کے خلاف جنگ کریں گے اور ان پر فتح حاصل کریں گے، پس وہ اللہ سے یہی سوال کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس نبی موعود کو جلدی بھیج دے تاکہ ان کو فتح حاصل ہو جائے۔

اب جو حضرات توسل کو منع فرماتے ہیں وہ اس دوسری روایت کو لیتے ہیں اور سبب نزول کی پہلی مذکورہ روایت کو دوسری کی نسبت کمزور سمجھتے تھے جب دوسری روایت زیادہ قوی ہوئی تو اس آیت سے توسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال صحیح نہیں بلکہ بعض مفسرین نے اس آیت کریمہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ آپ کی بعثت سے قبل وہ آپ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے تھے (ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں) مگر آپ کی بعثت کے بعد وہ منکر ہو گئے، لیکن اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ان دونوں روایتوں میں تقابل یا تضاد کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو تو

مان لیا جائے اور دوسری کو مکمل طور پر خارج کر دیا جائے، بلکہ دونوں روایتیں اپنی جگہ صحیح ہو سکتی ہیں، اہل کتاب آپؐ کی ذات مبارک کو توسل کا ذریعہ بھی بناتے ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی دعا بھی کرتے ہوں گے اور یہی بات اس دوسری تفسیر کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے کہ اہل کتاب مشرکین عرب کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے دُعا بھی مانگتے۔ اس میں تقابل و تعارض نہیں، اسی طرح جتنی تفسیریں اور اسبابِ نزول بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے کوئی تضاد ایسا نہیں کہ ایک کو مان لیا جائے تو دوسرے کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے۔ بلکہ حافظ ابن تیمیہؒ کے شاگرد حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی بدائع الفوائد میں پہلی تفسیر کو نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں

ان الیھود یحاربون جیرانھم من العرب فی الجاھلیہ ویستنصرون علیھم بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل ظھورہ فیفتح لھم وینصرون علیھم۔ اھ (بدائع الفوائد ج ۴ ص ۱۴۵)

زمانہ جاہلیت میں یہود اپنے عرب پڑوسیوں سے لڑتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ (یعنی ان کے وسیلے سے) نصرت اور مدد طلب کرتے تھے تو ان کو فتح ہو جاتی اور ان کی مدد کی جاتی۔

قائلین کا احادیث سے استدلال

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب (بھول کر) لغزش ہوئی (جس کی وجہ سے جنت سے دنیا میں بھیج دیئے گئے) تو ہر وقت روتے تھے اور دعا، و استغفار کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آسمان کی طرف منہ کیا اور عرض کیا۔ اسئلک بحق محمد غفرت لی۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں، وحی نازل ہوئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں (جن کے واسطہ سے تم نے استغفار کیا) عرض کیا کہ جب آپ نے مجھے پیدا کیا تو میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ تو میں سمجھ گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے (مخلوق میں) اونچی ہستی نہیں ہے جن

کا نام آپ نے اپنے نام کے ساتھ رکھا ہے. وحی نازل ہوئی کہ وہ خاتم النبیین ہیں، تمہاری اولاد میں سے ہیں لیکن وہ نہ ہوتے تو تم پیدا نہ کیے جاتے۔

اس کے جواب میں منکرین توسل فرماتے ہیں کہ پہلے تو یہ حدیث بہت کمزور ہے دوسرے یہ کہ قرآن مجید کے متقابل ہے. اس لئے اس پر کسی طرح استدلال نہیں ہو سکتا. قرآن مجید اور دوسری صحیح احادیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی جو دعائیں ذکر ہیں، ان میں اس کی طرف اشارہ تک نہیں۔

لیکن اس اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ فی الواقع حضرت آدم علیہ السلام نے اس وقت کیا کیا دعائیں کی ہوں گی اور کس کس طرح سے گڑگڑاتے ہوں گے۔ اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہوتی ہیں. اور ان میں کوئی تعارض اور تقابل نہیں، کیونکہ جس پر مالک کی ناراضگی ہو وہی جانتا ہے کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے پھر ایسے شخص پر جس کو فرشتوں سے سجدہ کروایا، اپنا مقرب بنایا، جو شخص جتنا مقرب ہوتا ہے، اتنا ہی عتاب کا اثر اس پر زیادہ ہوتا ہے، بشرطیکہ کمینہ نہ ہو اور وہ تو نبی تھے حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام اتنے روتے تھے کہ تمام دنیا کے آدمیوں کا رونا اگر جمع کیا جاتے تو ان کے برابر نہیں ہو سکتا، چالیس سال تک سر اوپر نہیں اٹھایا، اس لئے اگر دوسری دعاؤں کے ساتھ یہ بھی ہو کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اختیار فرمایا ہو تو اس میں تعارض اور تضاد کی بات نہیں البتہ حدیث ضعیف ضرور ہے لیکن اس توسل کے بارے میں اور احادیث بھی ہیں جن سے اس کی تائید ہو سکتی ہے۔

(۲) عن امیہ بن خالد بن عبد اللہ بن اسید عن النبی صلی اللہ	حضرت امیہ بن خالد بن اسیدؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ

لہ اخرجہ الطبرانی فی الصغیر والحاکم وابو نعیم والبیہقی کلاہما فی الدلائل وابن عساکر و فی الدرر و فی مجمع الزوائد رواہ الطبرانی فی الاوسط وفیہ من لم اعرفہم۔

علیہ وسلم انہ کان یستفتح بصعالیك المھاجرینؒ۔	علیہ وسلم فقرا۔ مہاجرین کے ذریعہ اللہ تعالے و تبارک سے فتح طلب کرتے تھے۔

(رواہ فی شرح السنۃ مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ ابن ملک رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقرائے مہاجرین کے توسل سے اس طرح دعا مانگتے تھے۔

اللھم انصرنا علی الاعداء بحق عبادك الفقراء المھاجرین۔	اے اللہ ہماری مدد فرما دشمنوں (کفار) کے مقابلہ میں تیرے فقرا۔ مہاجرین بندوں کے حق (وسیلہ) سے۔

(المرقاۃ کتاب الرقاق)

اور شیخ عبدالحق اشعۃ اللمعات میں یوں نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں اس طرح کہتے۔

اللھم انصرنا بفقراء المھاجرین۔	اے اللہ ہماری مدد فرما فقرا۔ مہاجرین کی برکت یا وسیلہ سے۔

اس سے منکرین توسل یہ جواب دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقرا۔ مہاجرین کی دعا کے ذریعے فتح مانگتے تھے نہ یہ کہ ان کی ذات پر توسل فرماتے تھے۔

اس بات کو قائلین توسل رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور حدیث شریف سے تو یہی توسل معلوم ہوتا ہے اور اس پر مرقات اور اشعۃ اللمعات کے حوالوں کی شہادت بھی موجود ہے۔

منکرین توسل کی طرف سے جواب یوں دیا جاتا ہے کہ دعویٰ بلا دلیل نہیں، بلکہ اس پر قوی دلیل موجود ہے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بہت دلیر، بہادر، قوت والے اور سخی شخص تھے۔ ان کا بیٹا مصعب بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہما صحیح بخاری میں ان سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعدؓ (یعنی اس کے باپ) کو یہ گمان ہوگیا کہ ان کو

لہ قال الملا علی قاری رحمہ اللہ ثم رأیت فی الجامع انہ رواہ ابن ابی شیبۃ والطبرانی عن امیۃ بن عبداللہ ولفظہ کان صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح ویستنصر بصعالیك المسلمین (المرقاۃ)

ان سے کم تر ضعیف اور فقیر شخص پر فضیلت حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ھل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم (بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۵ جلد دوم یعنی تمہاری مدد (دشمنان اسلام پر) نہیں کی جاتی اور نہ تمہیں رزق دیا جاتا ہے مگر اپنے ضعفاء کی برکت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ خیال اور گمان ہوا کہ ان سے کمزور اور ضعفاء کی نسبت اسلام کو زیادہ نفع ہے تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس گمان کی اصلاح کی اور یہ کلمات ارشاد فرمائے اور ان کلمات میں امت کو یہ بتایا کہ یہ گمان رکھو کہ آپ کو قوت، شجاعت وغیرہ کی وجہ سے دوسرے فقراء اور کمزور مسلمانوں پر فضیلت حاصل ہے بلکہ انہی ضعفاء اور کمزور مسلمانوں کی مخلصانہ دعاؤں کی برکت سے آپ کو کفار و مشرکین پر فتح حاصل ہوتی ہے اور رزق بھی۔

یہاں تو ظاہر ہے کہ ضعفاء اور کمزوروں کے طفیل دعا مانگنا مقصود نہیں اور نہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان پر توسل کر کے دعا کی تھی بلکہ یہاں مراد صرف ان کے اخلاص اور دعا کی برکت بتانا ہے اور کمزور، ضعیف لوگوں کو کم تر نہ سمجھنے کی تعلیم ہے پس اسی طرح مذکورہ بالا حدیث سے بھی مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء مہاجرین کی دعا کے ذریعے فتح مانگتے تھے۔

(۳) اسی طرح ابن ابی شیبہؒ نے بسند صحیح مالک دار جازن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں قحط پڑ گیا تو ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر تشریف لے گئے اور کہا یا رسول اللہ استسق اللہ لامتک فانھم قد ھلکوا فاتاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام فقال ائت عمر فاقرئہ السلام واخبرہ انھم یسقون (الحدیث) (وفاء الوفا ج ۴ ص ۱۳۷۴ مطبوعہ احیاء التراث العربی) اے رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لئے بارش مانگ لیں، وہ تو ہلاک ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو خواب میں آئے اور فرمایا کہ عمرؓ کے پاس جاؤ، ان کو سلام کہنا اور خبر دینا کہ ان پر بارش برسائی جائے گی۔

اس حدیث سے استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی جب کہ آپ برزخ میں ہیں۔ گویا یہ توسل میں مبالغہ ہے جس کا تعلق مسئلہ استشفاع سے ہے، تو اس پر نہ حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا اور نہ اور کسی صحابی نے ان کے اس فعل کو برا جانا۔

اس روایت پر مانعین توسل اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں خواب دیکھنے والا شخص نامعلوم ہے کہ یہ شخص کون تھا اس کا نام کیا تھا، صحابی تھا یا غیر صحابی وغیرہ۔

اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ خواب دیکھنے والا کوئی نامعلوم شخص نہیں بلکہ وہ ایک صحابی ہے جس کی نشان دہی سیف بن عمر نے "الفتوح" میں کی ہے کہ خواب دیکھنے والے ایک صحابی تھے جس کا نام بلال بن الحارثؓ المزنی ہے، لیکن مانعین اس کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیف بن عمر ایک ایسا راوی ہے جس پر ائمہ جرح و تعدیل نے سخت تنقید کی ہے بلکہ بعض نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ وہ واقدی کی طرح جھوٹی اور من گھڑت حدیثیں گھڑتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ سیف بن عمر بہت ہی کمزور اور ضعیف راوی ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ اور صرف اس کی روایت پر اعتماد کرکے اس شخص سے حضرت بلال بن الحارثؓ المزنی مراد لینا صحیح نہیں۔ لہذا روایت میں اس شخص کو بدستور ایک نامعلوم شخص سمجھا جائے گا۔ اس کے جواب میں قائلین کہتے ہیں، اگر مان لیا جائے کہ خواب دیکھنے والے کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے لیکن مالک الدار ایک ثقہ راوی ہیں جو اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اس مسئلہ کو ایک نامعلوم شخص کے خواب اور اس کے توسل کرنے پر استدلال کرکے اس کو ثابت نہیں کیا جاتا، بلکہ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ وہ شخص حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور انہیں خبر دی تو حضرت عمرؓ رو پڑے اور فرمایا اے میرے رب۔ میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی مگر جس امر سے میں عاجز ہو گیا، تو یہاں استدلال اس بات سے ہے کہ حضرت عمرؓ کا اس شخص کے خواب اور اس کے اسی طرح توسل کرنے پر کوئی انکار نہ فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس توسل کو جائز سمجھتے تھے ورنہ حضرت

عمرؓ اس پر ضرور انکار فرماتے اور اس کی اس کارروائی پر اس کی تغلیط کرتے۔
اسی طرح اس حدیث میں قائلین اور مانعین دونوں کے لئے بحث کی کافی گنجائش ہے۔ نیز دونوں فریق اس حدیث کی سند پر بھی بحث کرتے ہیں۔ کوئی اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نے اس کو کمزور اور ناقابل اعتبار بنانے کی زور آزمائی کی ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس طرح اس حدیث کو بالکل صحیح اور بے غبار ثابت کرنا سخت مشکل ہے۔ اسی طرح یہ بھی آسان نہیں کہ اس کو ایسا کمزور اور ناقابل اعتبار ثابت کر کے بالکل مسترد کیا جائے۔ واللہ اعلم۔

(۴) اور سنن الدارمی میں حضرت ابوالجوزاء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ کے لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کر کے اس کا علاج دریافت کیا۔

فقالت انظروا قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاجعلوا منہ کوا الی السماء حتی لا یکون بینہ وبین السماء سقف ففعلوا فمطروا مطرا حتی لا یکون بنت العشب وسمنت الابل حتی تفتقت من الشحم فسمی عام الفتق۔ (رواہ الدارمی مشکوٰۃ باب الکرامات[1])

پس عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو دیکھو کہ آسمان کی طرف روشن دان بناؤ۔ یہاں تک کہ اس قبر اور آسمان کے درمیان چھت (حجاب) نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ سو ان پر بہت بارش برسائی گئی یہاں تک کہ گھاس اگی اور اونٹ موٹے ہو گئے اور چربی سے پھول گئے تو اس سال کا نام عام الفتق رکھا گیا۔

اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے توسل میں مبالغہ کی وجہ سے یہ سب کچھ کیا۔ جیسا کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ اشعۃ اللمعات میں لکھتے ہیں۔
کہ در حقیقت استسقاء واستشفاع ست بذات شریف وکشف قبر مبالغہ است دراں (اشعۃ اللمعات کتاب الفتن، باب الکرامات الفصل الثالث) یعنی حقیقت میں یہ استسقاء اور ذات شریف پر توسل کرنا ہے اور قبر کی طرف اوپر سے کھڑکی کھولنا توسل میں مبالغہ کے لئے ہے۔

---

[1] سنن الدارمی جلد اول صفحہ ۴۳ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان پاکستان۔

اسی طرح ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بھی مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں لکھا ہے (دیکھئے مرقاۃ ج ۱۱ ص ۲۳۱، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ پہلے تو اس حدیث کی سند پر تنقید موجود ہے۔ اگر اس کی سند کو معتبر بھی تسلیم کیا جائے پھر بھی اس سے قولی توسل (یعنی زبانی یوں کہنا کہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہم پہ بارش نازل فرما دیجئے) ثابت کرنا صحیح نہیں، قائلین توسل کا جواب اوپر گزر چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا توسل میں مبالغہ ہے۔ واللہ اعلم۔

(۵) حضرت فاطمہ بن اسد رضی اللہ عنہا (جو حضرت علیؓ کی والدہ ہیں) کی وفات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں گئے اور ان کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا۔ ماں، اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے۔ اسی حدیث میں ہے کہ آگے حضورؐ نے یہ دعا کی۔

اللہ الذی یحیی و یمیت وھو حی لا یموت اغفر لامی فاطمۃ بنت الاسد ولقنہا حجتہا ووسع علیہا مدخلہا بحق نبیک والانبیاء قبلی فانک ارحم الراحمین۔

(رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو جلاتا اور مارتا ہے وہ زندہ ہے کبھی نہیں مرتا، اے اللہ بخش دے میری ماں فاطمہ بنت اسد کو اس کو حجت تلقین فرما اور فراخ کر دے اس کی قبر تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کے ذریعہ اور جو انبیاء علیہم السلام مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں (ان کے حق کے طفیل) بے شک آپ ہی ارحم الراحمین (سب سے زیادہ رحم کرنے والے) ہیں۔[1]

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں۔

(۶) حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی روایت جو متعدد کتابوں میں موجود ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسے نقل کیا ہے ایسی ہے۔

ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضرت آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو عافیت اور بینائی دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) قال الہیثمی رحمہ اللہ فیہ روح بن صلاح وثقہ ابن حبان والحاکم وفیہ ضعف وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۵۷)

نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو دعا کروں اور اگر چاہے تو صبر کرے اور صبر ہی تیرے لئے بہتر ہے اس نے کہا کہ حضرت آپ دعا کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ اچھی طرح وضو کرے اور یہ دُعا کرے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَّبِیِّ الرَّحْمَۃِ اِنِّیْ تَوَجَّھْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ ھٰذِہٖ لِتُقْضٰی لِیْ۔ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْہُ فِیَّ (رواہ الترمذی فی ابواب الدعوات وقال ہذا حدیث حسن غریب)

اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی محمد رحمت والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے متوجہ ہوتا ہوں۔ اے نبی میں تیرے وسیلے کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری یہ حاجت پوری کی جائے (اے اللہ) آپ میرے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کو قبول فرمائیں۔

اس حدیث کے جواب میں منکرین توسل کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ اس میں درخواست اللہ تعالیٰ و تبارک ہی سے ہے کہ میرے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو قبول فرماویں، حدیث کے الفاظ میں صراحۃً موجود ہے فشفعہ فیَّ یعنی اے اللہ تو اُن کی شفاعت میرے بارے میں قبول فرما تو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہی پر توسل ہے۔ ذات مبارک صلی اللہ علیہ وسلم پر توسل ثابت نہیں ہوسکتا۔ قائلین توسل نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں، یہاں دو ہی کو نقل کیا جاتا ہے۔ اول اگر یہاں صرف دعا کی قبولیت کے بارے میں اللہ سے درخواست مقصود تھی یعنی صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر توسل مقصود تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی لمبی دُعا کیوں تعلیم فرمائی جس میں توسل بالذات کی بھی تصریح موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تعلیم فرمایا و اتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ اور تیری طرف تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی رحمت ہیں کے وسیلے سے متوجہ ہوتا ہوں۔ پس توسل

ﻟﮧ اس کے جواب میں منکرین توسل کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تیری طرف تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی رحمت ہیں کی دعا کے وسیلہ اور ذریعے سے متوجہ ہوتا ہوں اس لئے آخر میں یوں درخواست کی کہ اے اللہ تو ان کی شفاعت اور دعا میرے حق میں قبول فرما۔

بالذات یہاں صراحۃً موجود ہے فشفعہ فی۔ تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت پر توسل کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی مانگی کہ اے اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہمارے حق میں قبول فرما۔ بہر کیف حدیث شریف میں ذات مبارک صلی اللہ علیہ وسلم پر توسل واضح طور پر موجود ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر مراد صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر توسل کرنا ہوتا تو اس حدیث شریف کے راوی عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے خود یہ دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اوروں کو تعلیم نہ کی ہوتی۔ کیونکہ حدیث کا راوی حدیث شریف کا مطلب اور معنی دوسروں سے بہتر طور پر جانتا ہے خصوصاً جب کہ بات بھی سیدھی سادی ہے، اس میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں، چنانچہ طبرانی معجم کبیر میں نقل کرتے ہیں:

ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ضروری کام کے سلسلے میں آیا جایا کرتا تھا حضرت عثمانؓ بن عفان خلیفہ راشد (بوجہ مصروفیت) نہ اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے۔ وہ شخص حضرت عثمان بن حنیفؓ سے ملا اور اپنی (حاجت) کی شکایت کی۔

فقال لہ عثمان بن حنیف ایت المیضاۃ	عثمان بن حنیف نے اس شخص سے کہا کہ وضو
فتوضا ثم ایت المسجد فصل فیہ	کی جگہ جاکر وضو کر پھر مسجد میں جاکر دو رکعت نفل
رکعتین ثم قل اللّٰھم انی اسئلك	نماز پڑھ اور یہ دعا کر اے اللہ تجھ سے سوال کرتا
واتوجہ الیك بنبینا محمد صلی اللّٰہ	ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں اپنے نبی حضرت

لہ منکرین توسل اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ حضرت عثمان بن حنیف کا ہی اجتہاد ہے کہ انہوں نے اس سے یہی سمجھا اور دوسروں کو تعلیم کی۔ ورنہ حدیث میں تو فَشَفِّعْهُ فِیَّ کے الفاظ اس بات کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ یہاں مراد اس سے یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرے کہ اے اللہ تو میرے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور دعا کو قبول فرما۔

لہ اور قائلین اس کے جواب میں یوں فرماتے ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

علیہ وسلم نبی الرحمۃ (الحدیث) — محمد صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی) نبی رحمت کے وسیلہ سے۔

اسی طرح مذکورہ بالا حدیث کی پوری دُعا ان کو بتائی۔ اور انہوں نے اسی طرح کیا۔ روایت کے آخر میں ہے کہ اس دعا کی برکت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی تعظیم و تکریم کی اور اس کا کام بھی کر دیا۔

امام طبرانی رحؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے[1] اور علامہ منذری رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو نقل کر کے طبرانی رحمہ اللہ کے اس قول "الحدیث صحیح" کی تائید کی ہے۔ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی اس کو دو طریق سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابوالحسن الہیثمی مجمع الزوائد میں اس حدیث شریف کو نقل کر کے اس کی صحت کا گویا اقرار کرتے ہیں، یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد کا ہے۔ اس پر نہ کسی صحابی نے خود خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے انکار کیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ توسل بالنبی بعد الوفاۃ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بلا کسی نکیر ہوتا رہا۔

اس کا جواب منکرین توسل کی طرف سے یوں دیا جاتا ہے کہ خلیفہ ارشد حضرت عثمانؓ بن عفان کو اس توسل کرنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے اس طرح توسل کر کے دعا مانگی ہے بلکہ دعا مانگ کر حاضر ہوتے۔ انہوں نے اس کا کام کر دیا۔ تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس شخص کے اسی طرح توسل یا حضرت عثمانؓ بن حنیف کے اس توسل کی تعلیم کرنے کی اطلاع امیر المومنین حضرت عثمانؓ بن عفان کو ہو گئی ہو گی اور انہوں نے ان پر نکیر نہیں فرمائی۔ البتہ حضرت عثمانؓ بن حنیف نے اس سے یہی توسل سمجھ لیا تھا اس لئے انہوں نے دوسرے کو بھی تعلیم کی۔[2]

---

[1] وقال الطبرانی عقبہ الحدیث صحیح بعد ذکر طرقہ التی روی بہا (مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۷۹)

[2] یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرت مالک الدار خازن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پر یہی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں مالک الدار خود اس شخص کی آمد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی حالت بیان کرنا روایت کرتے ہیں تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ثابت ہو سکتی ہے اور ان کا نکیر نہ کرنا معنی رکھتا ہے لیکن یہاں خلیفہ ارشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع کے ثبوت کے بغیر ان کے نکیر نہ کرنے کا کوئی معنی اور وزن نہیں۔ واللہ اعلم

اسی طرح اس کے جواز اور عدم جواز پر مذاہب اربعہ کے اور دیگر متاخرین علماء نے بہت طویل بحثیں کی ہیں، لیکن یہاں صرف علامہ شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ جو اہل حدیث (غیر مقلدین) کے امام سمجھے جاتے ہیں، اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے معتقدین بھی ان کو حجت کہتے ہیں، انہی سے کچھ نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ بالکل واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی میں وسیلہ بنانا اور آپ کے انتقال کے بعد دوسرے بزرگوں کو وسیلہ بنانا صحابہ کرامؓ کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے۔ کیونکہ جب حضرت فاروقؓ نے حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنایا تو کسی صحابی نے بھی اس کا خلاف نہیں کیا، میرے خیال میں جواز توسل نبی کریمؐ سے مخصوص کر دینا جیسا کہ عزالدین (ابو محمد عبدالسلام) کو وہم ہوا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں۔ اس عدم تخصیص کی دو دلیلیں ہیں، پہلے تو وہی صحابہ کا اجماع جس سے ہم مطلع کر چکے ہیں، اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ارباب فضل اور کمال کو بطور وسیلہ پیش کرنے کا دراصل یہ مطلب ہے کہ ان کے اعمال صالحہ اور کمالات کو وسیلہ بنایا جاتا ہے کیونکہ کوئی شخص وسیلہ بننے کے قابل ہی تب ہوتا ہے جب کہ وہ اعمال صالحہ کرے تو گویا جب کوئی شخص یوں کہے کہ اے اللہ میں فلاں صاحب کمال کو تیرے دربار میں وسیلہ پیش کرتا ہوں تو اس کا وسیلہ بننا بلحاظ کمال کے ہوگا اور نیک عمل کو وسیلہ بنانا حدیث سے ثابت ہے جیسا مسلم و بخاری وغیرہ میں موجود ہے کہ نبی کریمؐ نے ان تین شخصوں کا قصہ بیان کیا جو غار میں گھسے اور غار کے منہ پر پتھر آ گیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے بڑے عمل کو وسیلہ بنایا اور پتھر غار سے ہٹ گیا۔ تو اگر اعمال صالحہ سے توسل ناجائز ہوتا یا شرک ہوتا جس طرح عزالدین وغیرہ سخت گیر لوگ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان تین آدمیوں کی دعا قبول نہ کرتے اور نبی کریمؐ ان کا قصہ بیان کرنے کے بعد ان کے فعل توسل کو ضرور ناجائز قرار دیتے (قاضی مرحوم توسل کو ثابت کر کے اب منکرین توسل کے دلائل کا جواب دیتے ہیں) اور فرماتے ہیں کہ جب واضح ہو گیا کہ توسل جائز ہے تو اسے معلوم ہو گیا کہ جو دلائل منکرین توسل پیش کرتے ہیں مثلاً مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ

زُلْفٰی اور فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا اور لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ۔ ہمارے دعویٰ جواز توسل بالنبی والصالحین کے لئے مضر نہیں، بلکہ اگر ان آیات کو امتناع توسل کے لئے پیش کیا جائے گا تو یوں کہا جائے گا کہ محل نزع اور امتناع توسل سے یہ دلائل بالکل اجنبی ہیں کیونکہ مشرکوں کے اس قول سے کہ مانعبدہم الا الخ صاف واضح ہے کہ مشرک قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے، جو شخص بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے وہ اس کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ یہ سمجھ کر کہ خدا کے دربار میں اس کی عزت ہے اس کو وسیلہ بناتا ہے، اسی طرح یہ آیت فلا تدعوا مع اللہ الخ جواز توسل کے خلاف نہیں کیونکہ اس میں تو صرف یوں کہا گیا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو نہ پکارو اور یوں نہ کہو یا اللہ یا فلاں، اور جو کسی بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے وہ تو صرف اللہ کو پکارتا ہے ہاں اللہ کے کسی نیک بندہ کو بوجہ کمال وسیلہ بناتا ہے، جس طرح ان غار والے تین اشخاص نے اپنے نیک اعمال کو وسیلہ بنایا تھا۔ اور اسی طرح یہ آیت والذین یدعون من دونہ الخ جواز توسل کے خلاف نہیں کیونکہ مشرک تو ان کو بلاتے تھے جو ان کی سنتے نہیں تھے اور خدا کو جو ان کی سنتا ہے، اس کو نہیں بلاتے، لیکن کسی بزرگ کو وسیلہ بنانے والا تو صرف اللہ کو بلاتا ہے کسی دوسرے کو نہیں بلاتا، ہمارے سابق کلام سے منکرین توسل کے تمام دلائل کی بھی قلعی کھل جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان دلائل کو منع توسل سے دور کا بھی واسطہ نہیں، مثلاً ان کا یہ استدلال کہ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَّالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ الخ جواز توسل کے منافی نہیں، کیونکہ اس آیت میں صرف یہ بیان ہو رہا ہے کہ قیامت کو سب اختیارات اللہ کو ہوں گے۔ اور کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہوگا، لیکن جو شخص کسی بزرگ کو وسیلہ بناتا ہے اس کا تو کبھی عقیدہ نہیں ہوتا کہ یہ بزرگ اختیارات اخروی میں خدا کا شریک ہے، جو یہ عقیدہ رکھے کہ غیر اللہ کو امر آخرت میں کچھ اختیار ہے اس کو تو ہم بھی گمراہ سمجھتے ہیں، لیکن متوسلین کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہوتا، اسی طرح منکرین توسل کا آیت لَیْسَ لَکَ

"من الامر شیءٌ" اور آیت "قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً" سے استدلال کرنا
غلط ہے۔ کیونکہ ان آیتوں میں تو اس کی تصریح ہو رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کو امر اللہ میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔ اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے نفع
ونقصان کے مالک نہیں تو دوسرے کے نفع ونقصان کے کس طرح مالک ہو سکتے
ہیں، لیکن کسی نبی، ولی یا عالم کے توسل کے عدم جواز میں ان آیتوں کا کیا دخل، متوسل
کا تو یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ غیر اللہ کو امر آخرت یا نفع ونقصان میں کوئی اختیار ہے۔
توسل کا انکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار ہے اور شفاعت کا انکار
قرآن کا انکار ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود
یعنی مقام شفاعت عظمیٰ کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے۔ اور مخلوق کو یہ ہدایت کی
ہے کہ آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس شرف عظیم کی درخواست کیا کریں اور اللہ تعالیٰ
نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہے کہ مقام محمود کی درخواست کیا کرو، آپ کو دیا جائے
گا۔ اور امت کی سفارش کرو تمہاری سفارش مقبول ہوگی، ہاں شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ
کی اجازت سے ہوگا۔ پھر خاص اس کو جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں۔ اسی طرح منکرین
توسل کا نبی کریمؐ کے اس ارشاد کہ "اے فلاں بن فلاں میں تیرے لئے اللہ کی طرف سے
کسی چیز کا مالک نہیں" پیش کرنا جواز توسل کے خلاف نہیں کیونکہ اس کا تو صرف یہ مطلب
ہے کہ جب کسی کو اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو میں اس کا خلاف نہیں کر سکتا، اور
یہ بات ہر انسان جانتا ہے لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ توسل ناجائز ہے کیونکہ متوسل
کا یہ عقیدہ تو نہیں ہوتا کہ وسیلہ . . . . . امر اللہ میں دخیل ہے بلکہ اس کا تو
یہ مطلب ہوتا ہے کہ اختیار کلی صرف اللہ کو ہے اور میں صرف اسی سے درخواست کرتا
ہوں، ہاں کسی ایسے بزرگ کو جس کے طفیل دعا قبول ہو سفارشی بناتا ہوں اور وسیلہ پیش
کرتا ہوں۔ (ترجمہ تفسیر مصنفہ قاضی شوکانیؒ)

اور یہاں یہ شبہ بھی بالکل غلط ہے کہ (معاذ اللہ) جس شخص کے ذریعہ توسل کیا
جاتا ہے اس کا رتبہ یا شان اللہ تعالیٰ سے زیادہ نظر آتا ہے یا اس کا اس پر کوئی زور،

وجہ چل سکتا ہے، کیونکہ یہ صرف ایک وہم ہے، ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جن حضرات کے وسیلہ سے دعا مانگی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نیک و مقرب بندے ہوتے ہیں، اور ان سے محبت و تعلق، اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (بے شک اللہ کی رحمت محسنین سے قریب ہے) کے مصداق نزولِ رحمت کا ذریعہ ہے، پس توسل کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں بنتی کہ اے اللہ فلاں مقبول بندہ پر جو رحمت ہے اس کے توسل سے دعا کرتا ہوں، اور یہاں وہ ان الفاظ سے اپنے پوشیدہ تعلق و محبت کا اظہار کرتا ہے جس میں نہ کوئی خطرہ ہوسکتا ہے نہ مذکورہ بالا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

بلکہ توسل بالاعمال جو بالاجماع جائز ہے اور توسل بالشخص میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور ان کے درمیان یہ نزاع لفظی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو حضرات انبیاء اور صالحین کے توسل سے دعا کے قائل ہیں ان کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ وہ ان کی شخصیتوں کو (العیاذ باللہ) ان کے اوصاف کمالیہ اور ان کی دینی خدمات وغیرہ سے الگ کرکے توسل کرتے ہیں بلکہ ان کی دینی خدمات اور خداداد خوبیاں پیش نظر رہتی ہیں، صالحین پر ان کے نیک کاموں کی برکت سے اللہ کی رحمتیں برستی ہیں، ان کے ساتھ محبت ان کی دین کی خاطر عظیم قربانیوں کی وجہ سے کی جاتی ہے، ان حضرات کے ساتھ یہ محبت اور تعلق بذاتِ خود ایک پوشیدہ نیک عمل ہے، اب اس محبت کے عمل کے ساتھ آواز بھی شامل ہو جاتی ہے اور ان حضرات کے توسل سے اللہ سے سوال کیا جاتا ہے، گویا توسل بالاعمال اور توسل بالاشخاص اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور یہ مسئلہ بلانزاع جائز ہوسکتا ہے، اور اس بات کے حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ بھی قائل ہیں، چنانچہ وہ بحق فلاں کے ذریعہ سوال کرنے کے مختلف اسباب بیان کرتے ہوئے تحقیق کرتے ہیں،

فیحمل قول القائل: اسئلك بنبيك محمد على انه اراد انى بايمانى به وبمحبته واتوسل اليك بايمانى به ومحبته ونحو ذلك كما ذكرتم	یعنی اس قول کے کہنے والے (اے اللہ میں تجھ سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں) کو اس پر محمول کیا جائے کہ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ اے اللہ میں تجھ سے محمد

ان هذا جائز بلا نزاع قيل من اراد
هذا المعنى فهو في ذالك بلا نزاع
واذا حمل على هذا المعنى لكلام من
توسل بالنبي صلى الله عليه وسلم بعد مماته
من السلف كما نقل عن بعض الصحابة
والتابعين وعن الامام احمد وغيره كان
هذا حسنا وحينئذ فلا يكون في
المسألة نزاع ولكن كثيرا من العوام
يطلقون هذا اللفظ ولا يريدون
هذا المعنى فهؤلاء الذين انكر عليهم
من انكر (ص ۹۲ قاعدة جليلة التوسل والوسيلة)

صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کے ساتھ محبت
کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، اور اسی طرح اور
کوئی معنی مراد لیا جائے تو آپ کو یاد ہوگا کہ یہ بلا نزاع
[1] بالاتفاق جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ جس کا یہی
مقصد ہو تو وہ بلا نزاع صحیح ہے اور اگر اسی معنی
پر ان اسلاف کے کلام کو محمول کیا جائے جنہوں نے
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ پر توسل کیا جیسا
کہ بعض صحابہ، تابعین اور امام احمدؒ سے نقل کیا گیا
ہے تو یہ اچھا ہوگا۔ اور ایسی حالت میں مسئلہ اختلافی
نہیں رہتا، لیکن بہت سے عوام اس لفظ کو مطلق
بولتے ہیں اور اس سے یہی معنی مراد نہیں لیتے۔
یہی لوگ ہیں جن پر انکار کرنے والوں نے انکار کیا ہے۔

پس حضرت حافظؒ یہاں یہ فرماتے ہیں کہ عوام یہ الفاظ ویسے ہی (بلا سمجھے بوجھے)
بول دیتے ہیں، اور ان کی مراد اس سے جائز معنی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ امام ابن تیمیہؒ نے
جو کچھ فرمایا وہ کسی قدر صحیح ہے۔ تاہم اس کا جواب توسل کو ماننے والے یہ دے سکتے ہیں
کہ قابل غور بات یہ ہے کہ جس شخص پر وہ توسل کرتا ہے، اگر اس کا اس پر ایمان نہیں اور
اس کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے لئے) تعلق ہی نہیں تو وہ اس پر توسل ہرگز نہیں کرے گا
مسیلمہ کذاب یا غلام احمد قادیانی وغیرہ دجال و کذاب پر کوئی مسلمان توسل نہیں کرتا۔ اور نہ
ہی عیسائی، یہودی یا کسی اور باطل فرقہ کے سربراہ پر توسل کرتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کا باپ ہی
کیوں نہ ہو۔ باوجود پدری محبت کے وہ ہرگز اس پر توسل نہیں کرے گا۔ تو یہ بات اس کی

---

[1] کیونکہ جیسا کہ اتباع اور اطاعت رسول اعمالِ ظاہرہ ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا
اور آپ کے ساتھ محبت و تعلق رکھنا باطنی اعمال میں سے ہے چونکہ توسل بالاعمال بالاجماع جائز ہے اسی
لئے یہ توسل بھی بالاجماع جائز ہو سکتا ہے۔

دلیل ہے کہ جب وہ دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صالح شخص پر توسل کرتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کے ساتھ (اللہ تعالیٰ کے لئے) تعلق و محبت کی وجہ سے ہی کرتا ہے۔ اگرچہ وہ اس پر تصریح نہیں کرتا۔" تاہم ایک مسلمان سے ظاہر یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کے ساتھ عقیدت رکھنے کے طفیل اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے اور وہ اپنے ظاہری اعمال کو نظر انداز کر کے تواضع اور عبدیت کا ثبوت دیتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اے میرے پروردگار میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں کہ جس کو میں آپ کی بارگاہ عالی میں پیش کر کے اس کے ذریعے سے دعا کروں۔ البتہ صرف آپکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت کا تعلق ہے۔ پس اے اللہ آپ اس تعلق (جو ایک قلبی عمل ہے) کی لاج رکھتے ہوئے میری دعا کو قبول فرمایئے۔

الغرض توسل بالذات اور توسل بالاعمال میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں جس کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے بالکل جدا کر کے پہلے کو شرک اور دوسرے کو جائز قرار دیا جائے۔ اگر توسل بالاشخاص شرک ہوتا تو حضرت عمرؓ کا حضرت عباسؓ کے ذریعے توسل کرنا جس سے متنازع فیہ توسل بھی مراد ہو سکتا ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عثمان بن حنیف کی روایت میں نابینا صحابی کو ایسی دعا تلقین کرنا جس میں آپ کے ذریعے توسل کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اور بقول خود ابن تیمیہؒ بعض صحابہؓ تابعین اور امام احمدؒ وغیرہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر توسل کرنا وغیرہ۔ العیاذ باللہ یہ سب شرک میں داخل ہو گا۔

پھر ان روایتوں اور مثالوں سے علماء کی اکثریت نے توسل بالذات ہی مراد لیا ہے تو کیا فقہائے کرام، صحابہؓ حضرت عمرؓ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے العیاذ باللہ امت کی اکثریت کو شرک کے دلدل میں پھنسا دیا۔

اسی طرح پر قرآن کی آیت وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ سے بھی توسل کی یہی قسم مراد ہو سکتی ہے۔ اور اس کی شان نزول میں جو دوسری روایات وارد ہوئی ہیں وہ اس کے متعارض اور مخالف نہیں اور سب اسباب نزول یہاں بلا کسی تکلف اور بآسانی

جمع ہو سکتے ہیں۔

تو ایسی حالت میں سوچنے کی بات ہے کہ آخر اس توسل میں وہ کون سی خرابی ہے جس کے لئے فقہاء کے اقوال، احادیث اور آثار میں دور دور کی تاویلیں کرنے کی ضرورت پڑے یا ایسی احادیث جن میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو اس کو ضعیف یا موضوع ثابت کرنے پر پوری طاقت لگا دی جائے۔

فی الحقیقت اگر ہم ایسے ہی دور کے احتمالات نکالنے لگیں تو شاید شریعت کا کوئی حکم بھی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچ سکے گا، اسی طرح اگر قرآن مجید کی من مانی تفسیریں شروع ہو جائیں تو نہ کوئی چیز ناجائز ہوگی اور نہ ہی کوئی عمل شرک سے خالی ہوگا۔

الغرض یہ متنازع فیہ توسل کوئی شرک نہیں بلکہ اس میں دعا کی قبولیت کے ساتھ اور ایک فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین سے محبت بڑھ جاتی ہے اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مخلوق کے درمیان محبوب کے فضائل و اوصاف کو محبت کرنے والے میں، اس کی استعداد کے مطابق منتقل کر دیتے ہیں، درود شریف کے بارے میں اس آیت مبارکہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ کے متعدد فوائد اور اسباب میں یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ درود شریف پڑھنے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق اور محبت میں اضافہ ہوگا، اور یہی محبت درود شریف پڑھنے والے کو حسب استعداد، والہانہ انداز میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اتباع پر ڈال سکتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات امت کو سمجھائی ہے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احب　　　تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک

لے یعنی اس اختلافی توسل جس میں بزرگوں سے مانگا نہیں ہوا کرتا بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے، البتہ دعا کی قبولیت کی امید سے اللہ کے سامنے کسی صالح کے ساتھ اپنی قلبی محبت و عقیدت پیش کر کے اس کی شخصیت پر توسل کرتا ہے۔

الیہ من والدہ وولدہ والناس | کہ میں اس کو اس کے باپ اور اس کی اولاد
اجمعین (متفق علیہ مشکوٰۃ کتاب الایمان) | اور سارے لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں

پس محبت بڑھانے کے لئے مختلف ذرائع ہوتے ہیں، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے ساتھ ادب و احترام سے ملاقات کرنا اور آپ سے دعاؤں کی درخواست کرنا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (سورۃ النساء۔ آیت ۶۴)

یعنی اگر وہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنی جانوں پر حاضر ہوتے آپ کے پاس پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لئے (اللہ سے) مغفرت طلب کرتے تو وہ ضرور اللہ کو پاتے، بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا۔

یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعا کے لئے فرمایا ہے۔ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ سے عمرہ کرنے کی اجازت مانگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت بھی دی اور فرمایا۔

وقال اشرکنا یا اخی فی دعائک ولا تنسنا۔ | اے ہمارے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں شریک کرنا اور ہم کو نہ بھولنا۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کلمہ فرمایا ہے، جس کے بدلے میں مجھ کو تمام دنیا بھی خوش نہیں کر سکتی۔

(رواہ ابوداؤد والترمذی مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

اسی طرح آپ کی عدم موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور تبرکات کو دیکھنا اور ان کی حفاظت کرنا، آپ سے محبت بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ | اور بنالو ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰت والسلام

مُصَلّٰی - کے کھڑا ہونے کی جگہ کو جاتے نماز۔

مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کرتے رہے۔ اس پر ان کے قدم مبارک کے نشان بھی بطور معجزہ پڑ گئے ہیں (دیکھئے بخاری ج ۲ کتاب التفسیر)

اسی طرح جب بنی اسرائیل کو حضرت طالوت کے بارے میں من جانب اللہ بادشاہ مقرر ہونے میں تردد ہوا تو انہوں نے اپنے پیغمبر سے کوئی ظاہری حجت طلب کی اللہ تعالیٰ و تبارک کا ارشاد ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ - الآیۃ۔

(البقرہ آیت ۲۴۸)

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس (طالوت) کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ جو مقدس صندوق تم کھو چکے ہو، وہ صندوق تمہارے پاس (واپس) آ جائے گا اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور اس میں بچی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں چھوڑ گئی ہے موسیٰؑ اور ہارونؑ کی اولاد۔

اللہ ہی ان آیات کے اسرار اور حکمتوں کو خوب جانتا ہے، پھر بھی اس میں ایک حکمت یہ دکھائی دیتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آثار و نشانات دیکھ کر ان کی خداداد صفات اور کمالات اور دینی خدمات سامنے آتی ہیں، ان سے تعلق اور محبت مضبوط تر ہو جاتا ہے ان کی صداقت اور حقانیت پر یقین بڑھ جاتا ہے۔

بس اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور تبرکات کو رکھا گیا اور آپ نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

(۱) امام نسائی رحمہ اللہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفد بن کر حاضر ہوئے۔ ہم نے آپ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ کو خبر دی کہ ہمارے علاقہ میں (نصاریٰ) کی ایک عبادت گاہ ہے۔ ہم نے آپ سے آپ کے وضو سے بچا ہوا پانی مانگا، آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا۔

فتوضأ وتمضمض ثم صبه لنا في اداوة وامرنا فقال اخرجوا فاذا اتيتم ارضكم فاكسروا بيعتكم وانضحوا مكانها بهذا الماء واتخذوها مسجدا قلنا ان البلد بعيد والحر شديد والماء ينشف فقال مدوه من الماء فانه لا يزيده الا طيبا۔

(رواہ النسائی، مشکوٰۃ باب المساجد)

اور وضو فرمایا، اور منہ میں پانی ڈالا کلی کی پھر اس کو ہمارے لئے ایک چھاگل میں ڈال دیا، اور ہم کو حکم دیا کہ جاؤ جس وقت اپنی زمین کو پہنچو۔ اپنی عبادت گاہ (بیعۃ) کو توڑ ڈالو، اور اس کی جگہ یہی پانی چھڑکو، اور اس کو مسجد بنا لو۔ ہم نے عرض کیا کہ شہر دور ہے اور گرمی سخت ہے پانی خشک ہو جائے گا۔ فرمایا اس میں اور پانی ڈالو (اس لئے کہ) وہ اس کی برکت کو زیادہ کر دے گا۔

(۲) بخاری اور مسلم میں ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ مکہ میں ابطح میں تھے چمڑے کے ایک سرخ خیمہ میں تشریف فرما تھے، اور میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے آپ سے بچا ہوا پانی لیا اور

ورأيت الناس يبتدرون ذلك الوضوء فمن اصاب منه شيئا تمسح به ومن لم يصب منه اخذ من بلل يد صاحبه۔ الحديث

(متفق علیہ مشکوٰۃ باب السترۃ)

میں نے لوگوں کو دیکھا، جلدی جلدی لیتے تھے اس پانی کو جس کو مل جاتا، اپنے بدن پر مل لیتا اور جس کو نہ ملتا اپنے ساتھی کے ہاتھ سے تری لے لیتا (اور اپنے بدن پر مل لیتا)

پس بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے آثار اور تبرکات اپنے فدائین صحابہؓ پر تقسیم بھی کر دیتے تھے۔

(۳) امام ترمذیؒ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم فشرب من في قربة معلقة قائما فقمت الى فيها فقطعته (سنن الترمذی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے آپ نے لٹکی ہوئی مشک کے منہ سے کھڑے ہو کر پانی پیا، میں نے (فوراً) کھڑے ہو کر مشک

ابواب الاشربۃ وقال ہذا حدیث حسن غریب صحیح)

کا منہ رجہاں آپ کا منہ مبارک لگا تھا کاٹ لیا۔

(۴) بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی منیٰ فاتی الجمرۃ فرماھا ثم اتی منزلہ بمنیٰ ونحر نسکہ ثم دعا بالحلاق وناول الحالق شقہ الایمن فحلقہ ثم دعا ابا طلحۃ الانصاری فاعطاہ ایاہ ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقہ فاعطاہ ابا طلحۃ فقال اقسمہ بین الناس۔
(متفق علیہ مشکوٰۃ باب الحلق)

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ آئے اور جمرہ کے پاس آکر اس پر کنکر مارے۔ پھر منیٰ میں اپنے مکان میں آئے۔ پھر سر مونڈھنے والے کو بلایا اپنے سر کا دایاں حصہ اس کے آگے کیا۔ پھر ابو طلحہ انصاری کو بلایا اور اس کو وہ بال دیئے۔ پھر سر کا بایاں حصہ آگے کیا اور فرمایا اس کو مونڈھ دو۔ وہ بال بھی ابوطلحہ کو دے دیئے اور فرمایا اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو۔

(۵) مسلم شریف کی صحیح حدیث میں ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اس نے کسروانی طیلسان کا جبہ نکالا جس کے گریبان اور چاکوں پر ریشم کا کپڑا لگا ہوا تھا کہنے لگیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا جب وہ وفات پاگئیں تو میں نے لے لیا۔

وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسہا ونحن نغسلہا للمرضیٰ نستشفی بہا۔
(رواہ مسلم مشکوٰۃ کتاب اللباس)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے اور ہم بیماروں کے لئے اس کو دھوتے ہیں اور اس کے ذریعے شفا طلب کرتے ہیں۔

(۶) اسی طرح امام بخاری حضرت عثمان بن عبداللہ بن موہب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے ایک پیالہ دے کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔

وکان اذا اصاب الانسان عینٌ او شئ بعث الیہا مخضبتہ فاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور جب کسی کو نظر لگ جاتی یا کوئی تکلیف ہوتی وہ بڑا پیالہ ان کے پاس بھیجتا۔ وہ ام سلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک نکالتی۔ اس نے

وکانت تمسکہ فی جلجل من فضۃ فخضخضتہ لہ فشرب منہ قال فاطلعت فی الجلجل فرایت شعرات حمرا (رواہ البخاری والرقی مشکوٰۃ کتاب الطب)

انھیں چاندی کی خول میں رکھا ہوا تھا وہ اس پیالہ میں اس کو ہلاتی پھر وہ اسے پی لیتا عثمان بن عبداللہؒ فرماتے ہیں: میں نے خول میں جھانک کر دیکھا اس میں چند ایک سرخ بال تھے۔

اس قسم کے واقعات کی کافی تعداد کتب احادیث میں موجود ہے۔ اب یہاں اس کے سوا اور کیا مراد ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور محبت کے اظہار کے ذریعے، اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ کے موئے مبارک وغیرہ کے طفیل تبرک حاصل کرتے یا اللہ تعالیٰ سے شفایابی کی امید پر ان (آثار) کے ذریعے گویا عملی توسل کرتے اس پر حدیث شریف میں تصریح بھی موجود ہے۔

(۷) امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں اکثر تشریف لاتے اور میرے ہاں قیلولہ فرماتے تھے۔ میں آپ کے لئے چمڑے کا بچھونا بچھا دیتی۔ آپ اس پر سوتے تھے۔

وکان کثیر العرق فکانت تجمع عرقہ وتجعلہ فی الطیب فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ماھذا فقلت عرق نجعلہ فی طیبنا وھو من اطیب الطیب وفی روایۃ قالت یا رسول اللہ نرجو برکتہ لصبیاننا قال اصبت (متفق علیہ)

آپ کو پسینہ بہت آتا تھا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ جمع کرتی تھی اور خوشبو میں ملا دیتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ام سلیم یہ کیا ہے۔ ام سلیمؓ کہنے لگی: یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اس کو خوشبو میں ملا دیتے ہیں اور یہ نہایت عمدہ خوشبو ہے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ ام سلیمؓ نے کہا ہم اپنے بچوں کے لئے اس سے برکت کی امید رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نے خوب کیا۔

الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار دیکھنے سے آپ کے ساتھ تعلق اور محبت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور یہی محبت و تعلق اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔[۱]

---

[۱] بعض قائلین توسل ان روایات جن سے تبرک بآثار الصالحین ثابت ہو سکتا ہے انھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خلاصہ یہ کہ متنازع فیہ توسل عقائد میں سے نہیں جس کے لئے قطعی اور یقینی دلائل کی ضرورت ہو اور نہ اسی طرح توسل کرنا فرض یا واجب یا سنت موکدہ ہے تاکہ قائلین توسل سے اس کے ثبوت میں صریح اور صحیح احادیث یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عام معمول کا مطالبہ کیا جائے یا یوں کہا جائے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی طرح توسل کیوں نہ کیا یا فلاں خلیفہ ارشد یا فلاں امام نے اسی طرح توسل کیوں نہیں کیا۔ ان سوالات کی ضرورت تو اس وقت ہوتی جب کہ قائلین توسل اس کی فرضیت یا وجوب کے دعویدار ہوتے۔ لیکن جب وہ اس کی فرضیت وغیرہ کے قائل نہیں تو صرف اس کے جواز کے لئے ان سے یہ مطالبہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اسی طرح توسل کرنا فقہی طور پر ایک فرعی مسئلہ ہے جو قرآن و سنت کے خلاف نہیں ۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق فاعل حقیقی لینے اور دینے والا صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو سمجھا اور مانا جائے اور یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہی ہوگا اور جو اللہ جل شانہ کو منظور نہ ہو اس کا ہونا ناممکن اور محال ہے، اور جو کچھ قائلین کتاب و سنت سے پیش کرتے ہیں اگرچہ اس میں دوسری تفاسیر، تاویلات اور احتمالات کو زیادہ اہمیت اور فوقیت دی جاسکے، تاہم عدم تعارض و تقابل کی وجہ سے ان نصوص میں اسی طرح توسل کے احتمال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس پر عمل کرنا اور بہت سے جلیل القدر علماء کا اس کے جواز پر تصریح کرنا اور اس پر عمل کرنا اور ائمہ متبوعین میں سے کسی سے اس کی ممانعت صراحت سے صاف لفظوں میں منقول نہ ہونا بلکہ بعض ائمہ کے قول و فعل سے جواز معلوم ہونا یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو اس کے جواز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) روایات سے اس اختلافی توسل پر استدلال کرتے ہیں لیکن اس میں تامل کیا جاسکتا ہے البتہ ان روایات سے صالحین کے آثار پر تبرک حاصل کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے جس طرح سلف صالحین کی سیرت ان کے اقوال و افعال ان کے کارنامے سن کر ان سے محبت بڑھتی ہے اسی طرح ان کے آثار دیکھنے سے ان کی یاد تازہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھتی ہے شاید ان کے باقی اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو۔ واللہ اعلم۔

کے لئے کافی وشافی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر کوئی اس طرح توسل کئے بغیر دعا مانگے تو اس کو اللہ قبول نہیں فرمائیں گے۔ اور نہ یہ خیال کیا جائے کہ اس طرح توسل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس دعا کو قبول فرمائے بلکہ اس کی حیثیت صرف جواز کی ہے جس کی وجہ سے دعا کی قبولیت کی امید کی جاتی ہے اگرچہ بہتری اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ذریعہ دعا مانگی جائے یا صاف الفاظ میں اس طرح توسل کریں کہ یا اللہ میرا کوئی عمل ایسا نہیں جس کو میں آپ کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کے ذریعے سے دعا کروں البتہ آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت ہے، پس اے اللہ اس تعلق اور ان پر ایمان لانے کی لاج رکھ کر میری فلاں حاجت پوری فرما، یا اگر ایسا نہ کہیں صرف یوں کہیں کہ اے اللہ فلاں سے جو تعلق وعقیدت ہے اس کے طفیل میرا فلاں کام پورا فرما، اگر تعلق اور عقیدت کی تصریح نہ بھی کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن نیت میں یہی ہو یا اسی طرح اور کوئی جائز معنی ہو تو اس طرح توسل بالاتفاق جائز ہوگا، البتہ اس طرح مطلق توسل (یعنی یوں کہنا کہ اے اللہ فلاں کے طفیل یا واسطے میرا فلاں کام پورا فرما) کرنے میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ جو یہ فرماتے ہیں کہ عوام اس سے جائز معنی مراد نہیں لیتے، یہ بات ان کی کسی قدر صحیح ہے، اگرچہ ایک مسلمان کی اس کے سوا اس طرح کہنے سے اور کیا مراد ہو سکتی ہے تاہم عوام اور ناواقف مسلمانوں کی حالت ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ وہ کرتے اور کہتے ہیں، ان سے بھی ہمیں واقفیت ہے، اس لئے عوام کو مسئلہ کی پوری نوعیت سمجھانی چاہیئے تاکہ ایمان اور عقائد کی حفاظت ہو، نیز اس باب میں قدرے تفصیل سے بحث کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسی متنازع فیہ توسل میں دونوں طرف یعنی قائلین اور مخالفین کے لئے بحث مباحثے کی کافی گنجائش ہے، اس لئے جس طرح متنازع فیہ توسل کے نہ ماننے والوں کو گستاخ، گمراہ اور کافر کہنا ممنوع وناجائز ہے، اسی طرح اس کے قائلین کو مشرک اور گمراہ سمجھنا ناجائز اور بہت بڑا ظلم ہے، البتہ حدود سے تجاوز کرنا کہیں بھی جائز نہیں، اسی طرح محبت واحترام کے پردے میں مخلوق کی عبادت

بھی ناجائز ہے۔ محبت اور عبادت، دونوں کے حدود شریعت مطہرہ نے مقرر کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا کسی بھی مخلوق کی عبادت کو حرام اور شرک قرار دیا ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے کیوں نہ ہو۔ اس کے بالمقابل قابلِ احترام ہستیوں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وغیرہ کی تکریم واحترام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے محبت اور عبادت دونوں کے حدود اور احکام جدا جدا ہیں اور ان کو بلا امتیاز ایک دوسرے پر چسپاں کرنا سراسر ظلم اور قرآن مجید میں معنوی تحریف کے مترادف ہے اور عوام کو خواہ مخواہ افراط وتفریط میں مبتلا کرنا ہے۔

❖

باب پنجم

شرک فی الاطاعت

اور

التقلید

باب پنجم

شرک فی الاطاعت

شرک فی الاطاعت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی کی مستقل طور پر اطاعت کی جائے یعنی اگر کسی کا حکم، حکم الٰہی کے خلاف بھی ہو، پھر بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ و تبارک کا ارشاد ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ پ۱۰ آیت ۳۱

انہوں نے اپنے علما۔ اور راہبوں کو اللہ تعالےٰ کی بجائے اپنا پروردگار بنا رکھا ہے۔

اس آیت شریفہ کی تفسیر صحیح ترمذی میں یوں آئی ہے کہ حضرت عدی ابن حاتمؓ فرماتے ہیں، میں نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا میری گردن میں سونے کی صلیب تھی آپ نے فرمایا اے عدی اس بت کو اتار پھینکو اور میں نے آپ کو سورہ التوبہ کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ الخ کہ ان اہل کتاب نے اپنے علما۔ اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کی بجائے اپنا پروردگار بنا لیا ہے، چنانچہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں، فرمایا کہ یہ لوگ اپنے علما۔ اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اس کو حلال سمجھتے اور جب وہ ان پر کوئی چیز حرام کر دیتے تو یہ لوگ اس کو حرام قرار دیتے۔

معلوم ہوا کسی کی مستقل طور پر شارع یا قانون ساز کی حیثیت سے اطاعت کرنا ناجائز اور ممنوع ہے، جس طرح کہ اہل کتاب نے حلال و حرام قرار دینے کا مکمل اختیار اپنے علما۔ اور راہبوں کو دے رکھا تھا، مگر جو اطاعت مخلوق کی ہو لیکن حکم الٰہی کے ماتحت ہی ہو، وہ اطاعت شرک یا حرام نہیں بلکہ مطلوب اور محمود ہے جیسے فقہائے اُمت

اور آئمہ مجتہدین کی تقلید اور اطاعت۔ کیونکہ ان حضرات کا فقہ اور اجتہاد، قرآن و سُنت کے تابع ہوتا ہے یعنی اللہ رب العزت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے اور یہ اطاعت عین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کو چھوڑ کر اپنے آبا و اجداد کی پیروی کرنا بھی حرام اور ممنوع ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ۔ پ۲ آیت ۱۷۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں نہیں ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے (اللہ فرماتے ہیں) بھلا اگر ان کے باپ دادا عقل اور ہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی۔

اس آیت مبارکہ سے جس طرح آبا و اجداد کی اندھی تقلید اور اتباع کی مذمت ثابت ہوتی ہے اسی طرح مخلوق کی جائز اتباع اور تقلید کی شرائط کی نشان دہی بھی ہو گئی ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے باپ دادوں کی مذموم تقلید کے دو سبب بیان فرما دیئے۔ ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو برملا رد کر کے انہیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے آبا و اجداد عقل اور ہدایت سے کورے تھے (لَا یَعْقِلُوْنَ اور لَا یَهْتَدُوْنَ) جس سے معلوم ہوا کہ اگر آبا و اجداد اور ایک عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے اور اس کو عقل یعنی درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے اگر جو احکام قرآن و حدیث میں صراحتاً نہ ہوں، ان کو بذریعہ اجتہاد اور عقل نصوصِ شرعیہ سے نکال سکتا ہے تو ایسے عالم اور مجتہد کی تقلید اور اتباع اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور اطاعت ہے۔

قرآن مجید ہی سے اہلِ حق، اہلِ علم و عقل اور اہلِ رشد و ہدایت آبا و اجداد، باپ دادوں کی پیروی اور اتباع ثابت ہے جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے

وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے انہوں نے جواب میں عرض کیا۔

نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (البقرہ آیت ۱۳۳)	ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے باپ دادوں کے خدا کی (یعنی) ابراہیم، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی، وہ خدائے واحد جو لاشریک ہے

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں تقلید کی دونوں قسموں، یعنی حق و باطل کی مثال موجود ہے۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ (سورہ یوسف آیت ۳۷ تا ۳۸)	میں نے اس قوم کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور میں نے پیروی کی اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیمؑ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ملت اور مذہب کی۔

اس سے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ جل شانہ اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں بے وقوف باپ دادوں کی تقلید حرام اور ممنوع ہے لیکن اگر باپ دادا علم و عقل اور رشد و ہدایت پر ہوں تو ان کی اتباع جائز اور پسندیدہ ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فقہائے امت اور مجتہدین جن کی بصارت و بصیرت، علم و تقویٰ ہر لحاظ سے ایک مسلّم حقیقت ہے کی تقلید اور اتباع کرنا جائز اور مطلوب ہے۔ اور جو لوگ ائمہ مجتہدین کی تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کر کے شرک و کفر قرار دیتے ہیں وہ سخت غلطی اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ اس موضوع پر حضرت مولانا تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی کتاب "تقلید کی شرعی حیثیت" میں بہت ہی منصفانہ بحث کی ہے۔ اس باب میں حضرت کی کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

تقلید کی حقیقت

دین کی اصل دعوت صرف ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت و اطاعت کی طرف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اسی لئے واجب ہے کہ آپؐ نے اپنے اقوال و افعال سے اللہ کے احکام کی ترجمانی

فرمائی ہے، حلال وحرام اور جائز وناجائز کو واضح فرمایا۔

قرآن وسنت میں بعض احکام اور باتیں تو ایسی ہیں جنھیں ہر ایک شخص بآسانی سمجھ لیتا ہے، مثلاً:

لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (سورۃ الحجرات) — تم میں سے کوئی کسی کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔

معمولی لکھا پڑھا آدمی اور تھوڑی سی عربی جاننے والا اس آیت کے معانی جان لے گا یا مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ — (یعنی) کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔

یہ ارشاد بھی بالکل آسان اور واضح ہے اور اس میں بھی کوئی پیچیدگی یا الجھن نہیں لیکن قرآن وسنت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن میں اجمال پایا جاتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسری آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی کسی دوسری حدیث سے متعارض نظر آتے ہیں مثلاً:

(۱) وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ — اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین قرء گزرنے تک انتظار کریں گی۔

یہ مطلقہ عورت کی عدت کا بیان ہے جس کی مدت تین قرء بیان کی گئی ہے قرء کا لفظ عربی زبان میں حیض (ماہواری) کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور طہر (پاکی) کے لئے بھی۔ اگر پہلا معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تین مرتبہ ایام ماہواری گزر جائیں۔ اگر دوسرے معنی لئے جائیں تو تین "طہر" گزرنے پر عدت پوری ہو گی۔ اب سوال یہ ہے کہ کس معنی کو لیا جائے؟

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من کان له امام فقراءة الامام له قراءة — جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کے لئے بھی قرأت بن جائے گی۔

دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے:

لا صلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة — جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز

الکتاب۔ نہیں ہوگی۔

اب دونوں حدیثوں کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی حدیث شریف کو بنیاد بنا کر دوسری حدیث کا مطلب یوں لیا جائے کہ یہ منفرد (اکیلے نمازی) کے لئے ہے۔ یا دوسری حدیث کو اصل مان کر یوں کہیں کہ پہلی حدیث میں قرآت سے مراد سورۃ فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورت ہے اور سورۃ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟

اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث سے احکام نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی سمجھ کو راہنما بنا کر اس قسم کے احکام میں فیصلے کرنے لگیں۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف اور بزرگوں نے ان آیات و احادیث کا کیا مطلب لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا طریقہ نہایت خطرناک ہے اور دوسرا طریقہ بہت محتاط ہے۔ یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ علم و فہم، تقویٰ و پرہیزگاری، دین و دیانت، ذکاوت و حافظہ کے لحاظ سے ہم لوگ قرونِ اولیٰ کے علماء کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے پھر وہ لوگ قرآن و سنت کو ہم سے بہتر بھی سمجھتے تھے کیونکہ نزول قرآن کے زمانے کے قریب تھے، اور اس زمانے کی معاشرت، طرزِ گفتگو، قرآن و حدیث کے صحیح پس منظر اور نزول کے ماحول سے مکمل واقف تھے۔

اب اگر ہم اپنی سمجھ پر اعتماد کرنے کی بجائے قرآن و سنت کے احکام میں اُس مطلب و مفہوم کو اختیار کرلیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے تو یوں کہا جائے گا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔

تقلید کی ضرورت

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ تقلید کی ضرورت وہاں پیش آئے گی جہاں قرآن و سنت کے کسی حکم کو ہم ٹھیک طرح نہ سمجھ سکیں۔ خواہ اس بنا پر کہ کسی عبارت کے ایک سے زیادہ معنی نکل سکتے ہوں یا اس میں تفصیل مذکور نہ ہو یا اس کے متعارض دلیل موجود ہو۔ قطعی احکام جن کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہو، میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مشہور حنفی عالم علامہ عبدالغنی نابلسیؒ فرماتے ہیں:

فالامر متفق عليه المعلوم من الدين بالضرورة لا يحتاج الى التقليد فيه لاحد الائمة كفرضية الصلوٰة والصوم والزكوٰة والحج ونحوها وحرمة الزنا واللواطة وشرب الخمر والقتل والسرقة والغصب وما اشبه ذلك والامر المختلف فيه هو الذي يحتاج الى التقليد فيه[1]

پس وہ متفقہ مسائل جن کا دین میں ہونا بداہۃً معلوم ہے، ان میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ حج وغیرہ کی فرضیت، اور زنا و لواطت، شراب نوشی قتل، چوری، غصب وغیرہ کا حرام ہونا۔ دراصل تقلید کی ضرورت ان مسائل میں پڑتی ہے جن میں علماء کا اختلاف ہو۔

اسی طرح علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

واما الاحكام الشرعية فضربان احدهما يعلم ضرورة من دين الرسول صلى الله عليه وسلم كالصلوات الخمس والزكوٰة وصوم شهر رمضان والحج وتحريم الزنا وشرب الخمر وما اشبه ذلك فهذا لا يجوز التقليد فيه لان الناس كلهم يشتركون في ادراكه والعلم به فلا معنى للتقليد فيه وضرب آخر لا يعلم الا بالنظر والاستدلال كفروع العبادات والمعاملات والفروج والمناكحات وغير ذلك من الاحكام فهذا يسوغ فيه التقليد بدليل قول الله تعالى فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ

اور شرعی احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ احکام ہیں جن کا جزو دین ہونا بداہۃً ثابت ہے مثلاً پانچ نمازیں، زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج، زنا اور شراب کی حرمت اور اسی جیسے دوسرے احکام، تو اس قسم میں تقلید جائز نہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کا علم تمام لوگوں کو ہوتا ہے۔ لہذا اس میں تقلید کے کوئی معنی نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس کا علم فکر و نظر اور استدلال کے بغیر نہیں ہو سکتا، جیسے عبادات، معاملات اور شادی بیاہ کے فروعی مسائل۔ اس قسم میں تقلید درست ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فاسئلوا اہل الذکر یعنی اہل ذکر (علماء) سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے

---

[1] خلاصۃ التحقیق فی حکم التقلید والتلفیق من تخریج مطبوعہ مکتبۃ ایشیق، استنبول۔

اُستعلمون ولا ؟ ثمّ لو منعنا التقلید فی هذه المسائل التی هی من فروع الدین لاحتاج کل احد ان یتعلم ذلك و فی ایجاب ذلك قطع عن المعایش و هلاك الحرث والماشیة فوجب ان لیسقط۔"[1]

ہو نیز اس لئے کہ اگر ہم دین کے ان فروعی مسائل میں تقلید کو ممنوع کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص باقاعدہ علوم دین کی تحصیل میں لگ جاتے اور لوگوں پر اس (تعلیم) کو واجب کرنے سے زندگی کی تمام ضروریات برباد ہو جائیں گی اور کھیتوں اور مویشیوں کی تباہی لازم آئے گی لہٰذا ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا۔

کیا تقلید شرک ہے؟

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تقلید کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ امام یا مجتہد کو بذاتِ خود واجب الاطاعت سمجھ کر اس کا اتباع کیا جا رہا ہے، بلکہ مقصود تو قرآن و سنت کی پیروی ہے لیکن امام کی تشریح و تعبیر پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ قرآن و سنت کا شارح (تشریح کرنے والا) ہے۔ شارعِ شریعت یا قانون بنانے والا ہرگز نہیں، مقلد اپنے امام کو ماخذِ شریعت نہیں سمجھتا، بلکہ یہ سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرتا ہے کہ امام چونکہ قرآن و سنت کے علوم میں پوری بصیرت رکھتا ہے اس لئے اس کی تشریح زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

اب ذرا انصاف کی نظر سے دیکھ کر بتائیے کہ اس میں شرک یا گناہ کی کون سی بات ہے؟ اگر امام کو شارع (قانون ساز) یا بذاتِ خود واجب الاطاعت مانا جائے تو بلاشبہ یہ شرک ہے۔

دیکھئے فی الحال پاکستان میں جو قانون نافذ ہے وہ کتابی شکل میں مرتب اور مدون ہے۔ کروڑوں کی آبادی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو قانون کو کتابوں سے پڑھ پڑھ کر اس پر عمل کرتے ہیں؟ اچھے خاصے انگریزی دان بھی وکیل سے مشورہ لیتے ہیں، خود قانون کی کتاب براہِ راست سمجھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے وکلاء کو حاکم یا قانون ساز تسلیم کر لیا ہے۔

بس اسی طرح قرآن و سنت کے احکام کو ٹھیک طرح سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے

---

[1] الفقیہ والمتفقہ للخطیب بغدادی ج ۲ ص ۶۸، ۶۹ مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ ریاض ۱۳۸۹ھ۔

ائمہ مجتہدین پر اعتماد کرنے کو تقلید کہتے ہیں۔

تقلید کا ثبوت آیاتِ قرآن سے

تقلید کی حقیقت کے بارے میں قرآن کریم میں اصولی ہدایات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (سورۃ النسا۔ آیت ۵۹)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور اپنے آپ میں سے اولوالامر کی اطاعت کرو۔

"اولوالامر" سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک مسلمان حکام ہیں۔ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت مجاہد، حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت عطا بن السائب، حضرت حسن بصری، حضرت ابوالعالیہ اور دوسرے بہت سے مفسرین نے اس کا مطلب علما۔ اور فقہا۔ لیا ہے۔ اور امام رازیؒ نے اُسے ترجیح دی ہے اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امراء کی اطاعت کا نتیجہ بھی بالآخر علما۔ ہی کی اطاعت ہے کیونکہ امرا بھی شرعی معاملات میں علما کی اطاعت کے پابند ہیں۔

بہرحال اس آیت مبارک میں مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کریں اور ان علما۔ اور فقہا۔ کی اطاعت کریں جو اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی تشریح کرنے والے ہیں۔ اسی اطاعت کو اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔ آگے اللہ پاک فرماتے ہیں۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ الآیۃ۔ مذکورہ بالا

پس اگر کسی معاملے میں تمہارا باہم اختلاف ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس جملہ میں مجتہدین کو خطاب کیا گیا ہے اور امام ابوبکر جصاصؒ "اولوالامر" کا مطلب علما لیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

وقولہ تعالیٰ عقیب ذٰلک فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ

اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دینے کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اگر کسی معاملے میں تمہارے

يدل ان أولي الأمر هم الفقهاء لأنه امر سائر الناس بطاعتهم ثم قال فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فأمر أولي الأمر برد المتنازع فيه الى سنة نبيه صلى الله عليه وسلم اذ كانت العامة ومن ليس من اهل العلم ليست هذه منزلتهم لأنهم لا يعرفون كيفية الرد الى كتاب الله والسنة ووجوه دلائلها على احكام الحوادث فثبت انه خطاب للعلماء[1]

درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اولوالامر سے مراد فقہا ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا اور پھر فان تنازعتم الخ فرما کر اولوالامر کو حکم دیا کہ جس معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہو اسے اللہ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف لوٹا دو یہ حکم فقہا ہی کو ہو سکتا ہے کیونکہ عوام الناس اور غیر اہل علم کا یہ مقام نہیں ہے اس لئے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے اللہ کی کتاب اور سنت کی طرف کسی معاملے کو لوٹانے کا کیا طریقہ ہے اور نہ انہیں نت نئے مسائل اخذ کرنے کے لئے دلائل کے طریقوں کا علم ہوتا ہے لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ خطاب علماء کو ہے۔

مشہور اہل حدیث عالم علامہ نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اعتراف کیا ہے کہ فان تنازعتم الخ کا خطاب مجتہدین کو ہے۔

والظاهر انه خطاب مستقل مستأنف موجه للمجتهدين[2]

اور ظاہر ہے یہ مستقل خطاب ہے جس میں حکم کا رخ مجتہدین کی طرف ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جن میں اجتہاد کی اہلیت نہیں مختلف فیہ مسائل میں ان کو براہ راست قرآن و حدیث سے رجوع کر کے خود فیصلہ کرنا درست نہیں، عام لوگوں کو خطاب ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ اولی الامر یعنی فقہاء سے مسائل پوچھیں اور ان پر عمل کریں، جب کہ دوسرے جملے میں مجتہدین کو خطاب ہے کہ تنازعہ کی صورت میں کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر کے اپنی اجتہادی بصیرت کے ذریعہ احکام اخذ کریں۔ لہذا پہلے

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۵۷، [2] تفسیر فتح البیان ج ۲ ص ۳۰۸ مطبعۃ العاصمۃ۔ قاہرہ۔

جملہ میں عام مومنین کو تقلید کا حکم ہے اور دوسرے جملہ میں متبحر علماء کو اجتہاد کا۔

(۲) قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ

(نساء آیت ۸۳)

اور جب ان (عوام الناس) کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اس کی اشاعت کر دیتے ہیں، اور اگر یہ اس معاملے کو رسول کی طرف یا اپنے اولوالامر کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو لوگ اس کے استنباط کے اہل ہیں وہ اس کی (حقیقت) کو خوب معلوم کر لیتے۔

اس آیت سے یہ اصولی ہدایت ملتی ہے کہ جو لوگ گہری نظر اور تحقیق کی قابلیت نہیں رکھتے انہیں اہل استنباط (فقہاء مجتہدین) کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور وہ اپنی بصیرت سے جو راہِ عمل متعین کریں اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ چنانچہ امام رازیؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں،

فثبت ان الاستنباط حجة، والقياس اما استنباط او داخل فيه فوجب ان يكون حجة اذا ثبت هذا فنقول، الآية دالة على امور احدها ان في احكام الحوادث ما لا يعرف بالنص بل بالاستنباط وثانيها ان الاستنباط حجة، وثالثها ان العامي يجب عليه تقليد العلماء في احكام الحوادث[1]۔

پس ثابت ہوا کہ استنباط حجت ہے، اور قیاس یا تو خود استنباط ہے یا استنباط میں داخل ہے لہذا وہ بھی حجت ہوا۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت چند امور کی دلیل ہے ایک یہ کہ نت نئے پیش آنے والے مسائل میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو آیات سے صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے بلکہ ان کا حکم معلوم کرنے کے لئے استنباط کی ضرورت پڑتی ہے دوسرے یہ کہ استنباط حجت ہے اور تیسرے یہ کہ عام آدمی پر واجب ہے کہ وہ پیش آنے والے مسائل و احکام کے بارے میں علماء کی تقلید کرے۔

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۲۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ آیت جنگ کے مخصوص حالات کے بارے میں ہے۔ امام رازیؒ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

ان قوله وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ عام فی کل ما یتعلق بالحروب و فیما یتعلق بسائر الوقائع الشرعیة۔ لان الامن والخوف حاصل فی کل ما یتعلق بباب التکلیف فثبت انه لیس فی الآیة ما یوجب تخصیصها بامر الحروب۔[1]

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ جب ان کے سامنے امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے الخ بالکل عام ہے جس میں جنگ کے حالات بھی داخل ہیں اور تمام شرعی مسائل بھی۔ اس لئے کہ امن وخوف ایسی چیزیں ہیں کہ شریعت کے فرض کردہ احکام کا کوئی باب ان سے باہر نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اسے صرف جنگ کے حالات سے مخصوص کر دے۔

اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں۔

فی الآیة اشارة الی جواز القیاس وان من العلم ... ما یدرک بالاستنباط۔[2]

اس آیت میں قیاس کے جائز ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بعض علم ایسے ہیں جن کا ادراک (حاصل کرنا) استنباط کے ذریعہ ہوتا ہے۔

(۳) ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝

(سورۃ التوبہ آیت ۱۲۲)

پس کیوں نہ نکل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ (سمجھ) حاصل کریں اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہوشیار کریں، شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ علم حاصل کرنے والی جماعت پر یہ واجب ہے کہ وہ دوسروں کو شریعت کے احکام سے باخبر کرے اور دوسروں پر واجب ہے

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۲ [2] فتح البیان ج ۲ ص ۳۳۰۔

کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنے کے لئے ان کے بتلاتے ہوئے احکام پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، اس پر امام جصاصؒ گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فاوجب الحذر بانذارهم والزم المنذرين قبول قولهم۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں پر واجب کیا ہے کہ جب علماء ان کو احکام شریعت بتا کر ہوشیار کریں تو وہ اللہ کی نافرمانی سے بچیں اور علماء کی بات مانیں۔

(۴) اللہ پاک کا ارشاد ہے

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔

اس آیت شریفہ میں یہ اصول بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ عالم نہ ہوں وہ علم و فن کے ماہرین سے پوچھ کر عمل کیا کریں، اسی کو تقلید کہتے ہیں، علامہ خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں۔

اما من يسوغ له التقليد فهو العامي الذي لا يعرف طرق الاحكام الشرعية فيجوز له ان يقلد عالما ويعمل بقوله قال الله تعالى فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

رہا یہ مسئلہ کہ تقلید کس کے لئے جائز ہے سو یہ وہ عامی شخص ہے جو احکام شرعیہ کے طریقے نہیں جانتا، پس اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عالم کی تقلید کرے اور اس کے قول پر عمل کرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فاسئلوا اہل الذکر

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمرو بن قیسؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آیات بالا میں اہل الذکر سے مراد اہل علم ہیں۔

تقلید کا ثبوت حدیث شریف سے

قرآن کریم کے علاوہ حدیث شریف سے بھی تقلید کا جواز ثابت ہوتا ہے

(۱) عن حذيفةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انى لا ادرى ما بقائى

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے

لہ احکام القرآن للجصاصؒ ج ۲ ص ۲۶۲ ۲ے الفقیہ والمتفقہ للخطیب بغدادیؒ ج ۲ ص ۶۸ مطبوعہ دار الافتاء سعودیہ ریاض ۱۳۸۹ھ۔

نہیں معلوم نہیں میں کتنا عرصہ تمہارے درمیان رہوں گا، پس تم میرے بعد دو شخصوں کی اقتدا کرنا ایک ابوبکرؓ دوسرے عمرؓ۔

دیکھو، فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ۔ (رواہ الترمذی و ابن ماجہ و احمد)

حدیث شریف میں لفظ اقتدا آیا ہے جو دینی امور میں کسی کی پیروی کے لئے استعمال ہوتا ہے، عربی لغت کے مشہور عالم ابن منظورؒ لکھتے ہیں۔ القدوۃ والقدوۃ ما تسننت بہ یعنی قدوۃ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی سنت پر تم عمل کرو اور القدوۃ الاسوۃ قدوۃ کے معنی ہیں اسوۃ یعنی نمونہ، قرآن کریم میں بھی یہ لفظ دینی امور میں انبیاء علیہم السلام اور صلحاء کی پیروی کے لئے آیا ہے۔

اولٰئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ (سورہ انعام آیت ۹۰)

یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے پس تم ان کی ہدایت کی اقتدا کرو۔

پس مندرجہ بالا حدیث شریف میں لفظ اقتدا استعمال کیا گیا ہے جو کہ دینی امور میں کسی کی پیروی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور یہاں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے، اور اسی کا نام تقلید ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ۔

جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دے گا اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔

اس حدیث شریف سے صاف ظاہر ہے کہ تقلید جائز ہے اور عالم کے فتویٰ پر دلیل کی تحقیق کے بغیر عمل جائز ہے، کیونکہ سارا گناہ بے علم کو ہوگا جو فتویٰ دے۔ اگر فتویٰ کی تحقیق کے بغیر عمل جائز نہ ہوتا تو سوال کرنے والے کو بھی اس بات کا گناہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس نے فتویٰ کی صحت کی تحقیق کیوں نہیں کی، پس حدیث شریف سے واضح ہوگیا کہ جو شخص خود عالم نہ ہو اس کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ جو شخص اس کی معلومات

لہ مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۵۴۹ باب مناقب ابی بکرؓ و عمرؓ۔

کے مطابق قرآن وسنت کا علم رکھتا ہو مسئلہ پوچھ لے، اگر وہ غلط بتاتے تو گناہ عالم پر ہوگا پوچھنے والے پر نہیں۔

(۳) حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذریؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین وتأویل الجاھلین (رواہ البیہقی فی المدخل)[1]

ہر آنے والی نسل کے ثقہ لوگ اس علم دین کے حامل ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف کو باطل پرستوں کے جھوٹے دعووں کو اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے۔

اس حدیث شریف میں جاہلوں کی تاویلات کی مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان تاویلات کی تردید علماء کا فرض ہے اور تاویلات بھی وہی آدمی کر سکتا ہے جو علم دین اور عربی کی شُد بُد رکھتا ہو لیکن ایسے شخص کو بھی حدیث میں "جاہل" قرار دیا گیا اس کی تاویل کی مذمت کی گئی، پس جو لوگ مجتہدانہ بصیرت نہیں رکھتے انہیں قرآن وحدیث کے صحیح مطلب کو سمجھنے کے لئے اہل علم کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

صحابہؓ کے زمانے میں تقلید

صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں تقلید پر بکثرت عمل ہوتا رہا ہے جو صحابہ تحصیل علم میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتے تھے وہ فقہاء صحابہ سے پوچھ پوچھ کر عمل کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ سے تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی دونوں ثابت ہیں۔ ان روایات جن سے تقلید کا ثبوت ملتا ہے سے قبل تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی کے فرق کو سمجھ لینا چاہیئے۔

تقلیدِ مطلق

اگر ایک مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک لیا جائے اور دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کرلی جائے تو اس کو تقلیدِ مطلق یا تقلیدِ عام یا تقلیدِ غیر شخصی کہیں گے۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی ص ۳۶۔

تقلید شخصی

اگر تقلید کے لئے کسی ایک مجتہد عالم کو اختیار کیا جائے اور ہر مسئلہ میں اسی کے فیصلہ کو لیا جائے تو اسے تقلید شخصی کہتے ہیں۔

پہلے تو صحابہؓ کے دور میں تقلید مطلق کی مثالیں آتی ہیں۔

(۱) عن ابن عباسؓ قال خطب عمر بن الخطاب الناس بالجابیۃ، وقال یا ایہا الناس من اراد ان یسئل عن القرآن فلیأت ابی بن کعبؓ ومن اراد ان یسئل عن الفرائض فلیأت زید بن ثابتؓ ومن اراد ان یسال عن الفقہ فلیأت معاذ بن جبلؓ ومن اراد ان یسال عن المال فلیأتنی فان اللہ جعلنی لہ والیا وقاسماً۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جابیہ کے مقام پر خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! جو شخص قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہو وہ ابی بن کعبؓ کے پاس جائے جو میراث کے احکام کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابتؓ کے پاس جائے اور جو شخص فقہ کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ معاذ بن جبلؓ کے پاس جائے اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آجائے اس لئے کہ اللہ نے مجھے اس کا والی اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اس تقریر میں لوگوں کو تفسیر، فرائض اور فقہ کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ماہر اور ممتاز صحابہؓ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی کہ لوگ اُن کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کریں، یہی تقلید ہے۔

(۲) عن عبد الرحمٰن قال سألت محمد بن سیرینؒ عن دخول الحمام، فقال: کان عمر بن الخطابؓ یکرہہ۔

عبد الرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن سیرینؒ سے پوچھا کہ غسل کے لئے حمام میں داخل ہونا جائز ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ اسے مکروہ کہتے تھے۔

دیکھئے یہاں محمد بن سیرینؒ نے صرف اتنا کہا کہ حضرت عمرؓ اسے مکروہ کہتے تھے۔ اس کی کوئی دلیل نہیں بتائی۔

صحابہ کرامؓ میں سے بھی جو حضرات خود کو اہل اجتہاد یا اہل استنباط نہیں سمجھتے تھے وہ فقہاء صحابہؓ سے پوچھتے وقت دلائل کی تحقیق نہیں فرماتے تھے، بلکہ اعتماد کر کے مسائل

---

[1] اخرجہ مسدد (المطالب العالیہ للحافظ ابن حجرؒ ج ۱ ص ۱۸ الحدیث نمبر ۱۸۱)

پر عمل کرتے تھے۔

(۳) عن سلیمان بن یسار ان ابا ایوب الانصاریؓ خرج حاجاً حتی اذا کان بالنازیۃ من طریق مکۃ اضل رواحلہ وانہ قدم علی عمر بن الخطابؓ یوم النحر وذکر ذلک لہ فقال عمر بن الخطاب اصنع مایصنع المعتمر، ثم قد حللت فاذا ادرکک الحج قابلاً فاحجج واھد ما استیسر من الھدیؒ۔

حضرت سلیمان بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوایوبؓ انصاریؓ حج کے ارادے سے نکلے جب مکہ مکرمہ کے راستہ میں نازیہ کے مقام تک پہنچے تو انکی سواریاں گم ہوگئیں اور وہ یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) میں (جب حج ہو چکا تھا) حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو ان سے یہ واقعہ ذکر کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم وہ ارکان ادا کرو جو عمرہ والا ادا کرتا ہے (یعنی طواف اور سعی) اس طرح تمہارا احرام کھل جائے گا، پھر اگلے سال جب حج کا زمانہ آئے تو دوبارہ حج کرو اور جو قربانی میسر ہو ذبح کرو۔

اس مثال میں بھی نہ حضرت ابوایوبؓ نے مسئلے کی دلیل پوچھی نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتائی، انھوں نے فقط حضرت عمرؓ کے علم و فہم پر یقین کرکے عمل فرمایا، اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

(۴) عن مصعب بن سعد کان ابی اذا صلی فی المسجد تجوز واتم الرکوع والسجود والصلوٰۃ، قلت یا ابتاہ اذا صلیت فی المسجد جوزت واذا صلیت فی البیت اطلت؟ قال یا بنی انا ائمۃ یقتدی بنا (رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیحؒ)

حضرت مصعب بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد (سعد بن ابی وقاصؓ) جب مسجد میں نماز پڑھتے تو رکوع اور سجدہ تو پورا کرلیتے مگر اختصار سے کام لیتے اور جب گھر میں نماز پڑھتے تو رکوع سجدہ اور نماز کے دوسرے ارکان طویل فرماتے، میں نے عرض کیا ابا جان آپ جب مسجد میں نماز پڑھتے ہیں تو اختصار سے کام لیتے ہیں اور جب گھر میں پڑھتے ہیں تو طویل نماز پڑھتے ہیں، حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ بیٹے ہم لوگوں کے امام ہیں، لوگ ہماری اقتدا کرتے ہیں (یعنی لوگ ہمیں طویل نماز پڑھتے دیکھیں گے تو اتنی لمبی نماز پڑھنا ضروری سمجھیں گے اور جا و بے جا اس کی پابندی

ؒ موطا امام مالکؒ ص ۳۰۹ اجر من فات الحج ؒ مجمع الزوائد للہیثمی ج ۲ ص ۸۱ باب الاقتداء بالسلف۔

شروع کر دیں گے۔

پس ثابت ہوا کہ عام لوگ بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو دیکھ کر ان کی تقلید کرتے تھے، اس لئے وہ اپنے عمل میں اتنی باریک باتوں کا خیال رکھتے تھے۔

(۵) ان عمر بن الخطابؓ رأى على طلحة بن عبيد اللهؓ ثوبا مصبوغا وهو محرم فقال عمرؓ ما هذا الثوب المصبوغ يا طلحة؟ فقال طلحة بن عبيد الله يا امير المؤمنين انما هو مدر، فقال عمرؓ انكم ايها الرهط ائمة يقتدى بكم الناس فلو ان رجلا جاهلا رأى هذا الثوب، لقال ان طلحة بن عبيد الله قد كان يلبس الثياب المصبغة فى الاحرام فلا تلبسوا ايها الرهط شيئا من هذه الثياب المصبغة۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کو دیکھا کہ انہوں نے احرام کی حالت میں رنگا ہوا کپڑا پہن رکھا ہے حضرت عمرؓ نے ان سے کہا طلحہؓ یہ رنگا ہوا کپڑا کیسا؟ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا امیر المومنین یہ تو گیرو ہے (جس میں خوشبو نہیں ہوتی اور بغیر خوشبو کے رنگین کپڑا پہننا جائز ہے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ لوگ امام و مقتدا ہیں لوگ آپ کی اقتدا کرتے ہیں لہذا اگر کوئی ناواقف آدمی آپ کے جسم پر یہ کپڑا دیکھے گا تو وہ یہ کہے گا کہ طلحہ بن عبید اللہؓ احرام کی حالت میں رنگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے لہذا ہر قسم کے رنگین کپڑے پہننا جائز ہے چنانچہ وہ خوشبو والے رنگین کپڑے بھی پہننے لگیں گے لہذا آپ حضرات اس قسم کے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنا کریں۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا اور اہل کوفہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا۔

انی قد بعثت اليكم بعمار بن ياسر اميرا، وعبد الله بن مسعود معلما ووزيرا وهما من النجباء من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم من اهل بدر

میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسرؓ کو امیر بنا کر اور عبد اللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے اور یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریف صحابہؓ میں سے ہیں اور اہل بدر سے ہیں

لے مسند احمد ج ۱ ص ۱۹۲، احادیث عبد الرحمٰن بن عوفؓ۔

فاقتدوا بہما واسمعوا من قولہما۔ | پس تم ان کی اقتدا کرو اور ان کی بات سنو۔

(۷) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قضا کے اصول بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

فمن عرض لہ منکم قضاء بعد الیوم فلیقض بما فی کتاب اللہ، فان جاءہ امر لیس فی کتاب اللہ فلیقض بما قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فان جاءہ امر لیس فی کتاب اللہ ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فلیقض بما قضی بہ الصالحون، فان جاءہ امر لیس فی کتاب ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا قضی بہ الصالحون فلیجتہد رأیہ

آج کے بعد جس شخص کو قضا۔ کا معاملہ پیش آئے اسے چاہئے کہ وہ کتاب اللہ سے فیصلہ کرے پھر اگر اس کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے تو نبی کریم نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ پھر اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ ہو تو صالحین نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر ایسا معاملہ پیش آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور نہ صالحین نے، تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کی تشریح میں صالحین کا اتباع ضروری ہے یہی تقلید کا مقصد و مطلب ہے، پھر یہ حدیث قاضی اور عالم کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنی اجتہادی رائے پر صالحین اسلاف کے فیصلے کی طرف رجوع کرے۔

یہ چند مثالیں سرسری طور پر بیان کر دی گئی ہیں ورنہ کتب آثار ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ اس کے علاوہ صحابہؓ کے زمانے میں شخصی تقلید کی مثالیں بھی ہیں:

صحابہؓ کے زمانے میں تقلید شخصی

(۱) صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

ان اھل المدینۃ سألوا ابن عباس رضی اللہ عنہما من امرأۃ طافت ثم حاضت، قال لہم تنفر قالوا لا نأخذ

بعض اہل مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے ایسی عورت کے بارے میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہو گئی ہو کہ وہ طواف وداع کے

سنن النسائی ج ۲ ص ۳۰۵ کتاب ادب القضاۃ، الحکم باتفاق اہل العلم۔ وسنن الدارمی ج ۱ ص ۴۷ و ۵۰۔ مقدمہ

لئے پاک ہونے تک انتظار کرے یا طواف وداع بقول ابن عباسؓ بقول زیدؓ۔ اس سے ساقط ہو جائے گا؟ (اور بغیر طواف کئے واپس آنا جائز ہو گا) ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ (طواف وداع کے بغیر) جا سکتی ہے۔ اہل مدینہ نے کہا کہ ہم آپ کے قول پر زید بن ثابت کے قول کو چھوڑ کر عمل نہیں کریں گے۔

یہی واقعہ مسند ابو داؤد میں منقول ہے اس میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ منقول ہیں اے ابن عباسؓ جس معاملے میں آپ زید بن ثابتؓ کی مخالفت کر رہے ہیں اس میں ہم آپ کی اتباع نہیں کریں گے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ (مدینہ پہنچ کر) ام سلیمؓ سے پوچھ لینا (کہ جو جواب میں نے دیا ہے وہ درست ہے)[1]

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ زید بن ثابتؓ کی تقلید شخصی کرتے تھے اور انہیں کے قول کو حجت سمجھتے تھے۔ اور ابن عباسؓ نے اہل مدینہ کو ہرگز یہ نہیں کہا کہ تم لوگ ایک شخص کو تقلید کے لئے مقرر کر کے شرک اور گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے ام سلیمؓ سے پوچھا اور زید بن ثابتؓ سے عرض کیا تو زید بن ثابتؓ نے حدیث کی تحقیق کر کے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا اور اس کی اطلاع ابن عباسؓ کو بھی دی جیسے مسلم، نسائی اور بیہقی وغیرہ کی روایات میں وضاحت آتی ہے[2]۔

اگر اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر اہل مدینہ مقلد ہوتے تو ام سلیم سے تحقیق کیونکر کرتے، یہ بات دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ کسی مجتہد کی تقلید کے بعد احادیث کی تحقیق حرام ہو جاتی ہے، حالانکہ تقلید کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جو شخص قرآن و سنت کا مطلب سمجھنے، ظاہری تعارض کو دور کرنے اور ناسخ و منسوخ کا فیصلہ کرنے کی قابلیت خود میں نہیں پاتا وہ کسی مجتہد عالم سے تفصیلی دلائل کا مطالبہ کئے بغیر اس کے علم پر بھروسہ کر کے اس شخص کے فتویٰ پر عمل کر لیتا ہے۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ اور تحقیق تقلید کے بعد بند نہیں ہو جاتا۔ اس کا ثبوت وہ تفسیریں اور شرحیں ہیں جو مقلدین نے لکھی ہیں۔

---

[1] مسند ابو داؤد الطیالسیؒ ص ۲۲۹ مرویات ام سلیمؓ [2] فتح الباری ج ۳ ص ۴۶۸ و ۴۶۹۔

جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد وغیرہ میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث منقول ہے۔

عن معاذ بن جبلؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء؟ قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ؟ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ ولا فی کتاب اللہ؟ قال اجتہد رأیی ولا آلو، فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدرہ فقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما یرضی رسول اللہ

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ جب کوئی قضیہ تمہارے سامنے پیش آئے گا تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ اور سنت دونوں میں نہ ملے؟ عرض کیا اس وقت اپنی رائے سے اجتہاد و استنباط کروں گا اور حق تک پہنچنے کی کوشش میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ مسرت سے حضرت معاذؓ کے سینے پر اپنا دستِ مبارک مارا اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے اس قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ میں سے صرف ایک بڑے فقیہ صحابی کو چنا اور ان کو معلم، قاضی، حاکم اور مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کر دیا کہ وہ اُن کی

لہ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیۃ، باب اجتہاد الرای فی القضاء۔ اس حدیث پر امام جوزقانی نے جو اعتراضات کئے ہیں علامہ ابن القیم نے اس کا جواب بھی دیا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت معاذؓ کے جن اصحاب سے یہ حدیث مروی ہے ان میں کوئی بھی متہم، کذاب یا مجروح نہیں ہے، دوسرے انہوں نے خطیب بغدادیؒ کے حوالے سے اسی حدیث کا ایک دوسرا طریق عبادۃ بن نسی عن عبدالرحمن بن غنم عن معاذؓ بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے، وہذا اسناد متصل ورجالہ معروفون بالثقۃ نیز بتلایا ہے کہ یہ حدیث تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی قابل استدلال ہے (دیکھئے اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷۵، ۱۷۶)

اتباع کریں، آپ نے ان کو قرآن و سنت، قیاس و اجتہاد کے مطابق فتویٰ دینے کی اجازت بھی دے دی اس کا تو یہی مطلب ہے کہ آپ نے اہل یمن کو تقلید شخصی کا پابند بنا دیا۔

حضرت معاذؓ معلم و مفتی کے طور پر یمن گئے تھے، صرف ایک حکمران کے طور پر نہیں، ثبوت میں حدیث شریف دیکھئے، صحیح بخاری کی روایت ہے۔

عن الاسود بن یزیدؓ قال اتانا معاذ بن جبلؓ بالیمن معلما و امیرا فسألناہ عن رجل توفی و ترک ابنتہ و اختہ فاعطی الابنۃ النصف والاخت النصف۔[1]

حضرت اسود بن یزیدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہمارے پاس یمن آئے وہ ہمارے امیر بھی تھے اور معلم بھی تھے، ہم نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص نے وفات کے بعد اپنی بیٹی اور بہن چھوڑی ہے، ان کو کیا میراث ملے گی؟ تو حضرت معاذؓ نے بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف میراث دی۔

یہاں اگرچہ معاذؓ نے فتویٰ دے کر اس کی دلیل بھی نہیں بتائی، لیکن ان کا فیصلہ تقلیداً قبول کیا گیا۔

اسی طرح مسند احمد اور معجم طبرانی میں روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن تشریف لائے تو خولان کی ایک عورت پاس آئی اور سلام کے بعد کہنے لگی کہ اے شخص تمہیں کس نے بھیجا ہے، حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے، عورت نے کہا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے اور آپ اللہ کے رسول کے ایلچی ہیں، تو اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیامبر کیا آپ مجھے دین کی باتیں نہیں بتائیں گے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مجھ سے جو چاہو، پوچھو۔

پس حضرت معاذؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے احکام دین بتایا کرتے تھے، اسی حدیث میں حضرت معاذؓ نے عورت کو خاوند کے حقوق بتائے لیکن نہ کوئی آیت اور نہ کوئی حدیث سنائی، بلکہ اصول اسلام کے مطابق

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۷ کتاب الفرائض باب میراث البنات ۔ الہیثمی فی مجمع الزوائد ج ۴ ص ۳۰۷، ۳۰۸ باب حق الزوج علی المرأۃ۔

جواب دیا، اور لوگ اُن کی تقلید کرتے تھے، صرف اہل یمن نہیں بلکہ دوسرے صحابہ بھی ان کی تقلید کرتے تھے، چنانچہ ابو مسلم خولانیؒ کی روایت میں ہے کہ اہل دمشق کی ایک مسجد میں ایک حلقہ میں ادھیڑ عمر کے صحابہ کرامؓ موجود تھے، درمیان میں ایک جوان سرمگیں آنکھوں والے اور چمکدار دانت والے صحابی تھے، جب صحابہ میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو وہ فیصلہ اسی جوان صحابی سے کراتے، خولانیؒ نے اپنے ہم نشین سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ معاذ بن جبلؓ ہیں۔

یہ چند مثالیں تقلید شخصی کی نظیر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید کی دونوں قسموں (تقلید شخصی اور غیر شخصی) پر صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں عمل ہوتا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو شخص قرآن سنت سے براہ راست احکام نکالنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اصل کے اعتبار سے اس کے لئے تقلید کی دونوں قسمیں جائز اور درست ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں،

اور تقلید کی مذمت میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کا اطلاق اس شخص پر نہیں ہوتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے قول کو حجت نہیں مانتا، اور جس کا اعتقاد یہ ہے کہ حلال صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کر دیا اور حرام صرف وہ ہے جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کر دیا، لیکن چونکہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کا علم نہیں ہے، نہ وہ آپ کے کلام میں سے متعارض احادیث کی تطبیق کے طریقے سے واقف ہے اور نہ آپ کے کلام سے استنباط احکام کے طریقے جانتا ہے اس لئے وہ کسی ہدایت یافتہ عالم کی اس بناء پر اتباع کر لیتا ہے کہ یہ عالم (اپنے علم و تقویٰ کے پیش نظر) اپنے اقوال میں صائب (درست) ہوگا، اور ظاہری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا متبع ہوگا، چنانچہ اگر اس کا یہ گمان غلط ثابت ہو جائے تو وہ کسی جدال و اصرار کے بغیر اس کی تقلید سے دستبردار ہو جائے گا تو اس قسم کی تقلید سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے، جب کہ فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آتا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ انسان ہمیشہ ایک ہی شخص سے فتوے پوچھا

کرے (جسے تقلیدِ شخصی کہتے ہیں)، یا کبھی ایک شخص سے اور کبھی دوسرے شخص سے پوچھا کرے (جسے تقلیدِ مطلق کہتے ہیں) جب کہ اس میں مذکورہ بالا شرائط جمع ہوں، پس فی الحقیقت تقلیدِ شخصی ہو یا مطلق اصلاً جائز ہے۔

تقلیدِ شخصی کی وجہ

اب علماء و فقہا نے لوگوں کو صرف تقلیدِ شخصی پر عمل کرنے کے لئے کیوں فتویٰ دیا؟

فقہائے کرام نے محسوس کیا کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے احتیاط اور تقویٰ اُٹھتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر تقلیدِ مطلق کا دروازہ کھلا رہا تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے، مثلاً ایک شخص کا سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔ وہ اپنی سستی کی وجہ سے اس وقت امام شافعیؒ کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا، پھر اگر اس نے کسی عورت کو چھو لیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک برقرار ہے۔ اب اس کی تن آسانی اس کو ابو حنیفہؒ کی تقلید پر ڈالے گی۔ غرض جس امام کے قول میں اسے فائدہ اور آرام نظر آئے گا اسے لے لے گا۔ اور جہاں کسی کے قول میں نقصان یا خواہشِ نفس کی قربانی دکھائی دے اسے چھوڑ دے گا جس سے احکامِ شرعیہ نفسانی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیں گے، یہ چیز بلا اختلاف حرام ہے۔ اسی چیز کی خرابیوں کو واضح کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

امام احمدؒ وغیرہ نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض اپنی خواہشاتِ نفس کے زیرِ اثر ایک چیز کو پہلے حرام یا واجب سمجھے اور پھر اسی کو جائز یا حرام قرار دے دے، مثلاً وہ خود کسی کا پڑوسی ہو اور شفعہ کا دعویٰ کرنا چاہتا ہو تو امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق، یہ مذہب اختیار کر لے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو ہوتا ہے پھر جب کوئی دوسرا شخص پڑوس کی وجہ سے اس پر شفعہ کا دعویٰ کرے تو امام شافعیؒ

له حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۶ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۳۹۵ھ و عقد الجید ص ۲۹، ۴۴، ۴۲ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

کے مذہب کے مطابق یہ قول اختیار کرلے کہ شفعہ کا حق پڑوسی کو نہیں ہے یا مثلاً
ایک شخص کسی مرنے والے کا بھائی ہو اور میت کا دادا بھی موجود ہو تو یہ مذہب اختیار
کرلے کہ بھائی میراث میں دادا کے شریک ہوتے ہیں اور جب خود دادا بیٹے اور اس
کا پوتا اپنے بھائی چھوڑ کر مرجائے تو یہ مذہب اختیار کرلے کہ دادا کی موجودگی میں بھائی
وارث نہیں ہوں گے۔ [1]

صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں چونکہ خوف خدا اور فکر آخرت کا غلبہ تھا اس
لئے اس وقت تقلید مطلق میں کوئی برائی نہیں سمجھی گئی۔ اب چونکہ دیانت ختم اور
نفسانیت کا غلبہ ہے۔ اس لئے علماء نے انتظامی مصلحت کی بنا پر یہ فتویٰ دیا کہ اب
صرف تقلید شخصی جائز ہے اور آزاد تقلید (یعنی تقلید مطلق) کا طریقہ ترک کردینا چاہیئے
اگر ہر شخص کو اختیار ہو کہ جس مسئلہ میں چاہے جس مجتہد کی تقلید کرلے تو مذکورہ بالا مثالوں
کی طرح ایسے اقوال کا ایک مجموعہ تیار ہوجائے گا جو کہ شیطان اور نفس کا مذہب ہوگا
دین کا خواہشات کے تابع ہونا کسی کے ہاں جائز نہیں ہے بلکہ فقہائے کرام تو اتنے
محتاط تھے کہ وہ اپنے امام کے غیر مشہور اقوال پر بھی فتویٰ نہیں دیتے تھے کہ لوگوں میں
تقویٰ کی کمی ہے اور مختلف مذاہب سے آسانیاں تلاش کرکے ان پر عمل کی خواہش
رکھتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

اور تمام شہروں میں تقلید ان ائمہ اربعہ میں محصور ہوگئی۔ دوسرے ائمہ کے
مقلدین ختم ہوگئے اور لوگوں نے ان ائمہ سے اختلاف کا دروازہ بند کردیا جس کی
ایک وجہ تو یہ تھی کہ علوم کی اصطلاحات پیچیدہ ہوکر پھیل گئی تھیں۔ اور اس کی وجہ سے
اجتہاد کے مرتبے تک پہنچنا سخت مشکل ہوگیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس بات
کا اندیشہ تھا کہ اجتہاد نااہلوں کے قبضہ میں نہ چلا جائے اور ایسے لوگ اسے استعمال نہ
کرنے لگیں جن کی رائے اور دین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا علماء نے اجتہاد سے
عجز کا اعلان کردیا اور لوگوں کو ان ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی کی طرف لوٹا دیا اور اس بات

---

[1] الفتاوی الکبری لابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۲۳۷ مطبوعہ دار الکتب الحدیثہ۔

کو ممنوع کر دیا کہ ان ائمہ کی بدل بدل کر تقلید کی جائے، کیونکہ یہ طریقہ دین کے کھلونا بن جانے کا سبب ہو جاتا۔[1]

اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

"بلا شبہ یہ چار مذاہب جو مدون ہو کر تحریری شکل میں موجود ہیں۔ ان کی تقلید کے جائز ہونے کا تمام امت کا اجماع ہے اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ پوشیدہ نہیں بالخصوص اس زمانے میں جب کہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں، خواہش پرستی لوگوں کی گھٹی میں پڑ گئی ہے اور ہر ایک صاحب رائے اپنی رائے پر گھمنڈ کرنے لگا ہے۔[2]

تقلید شخصی کی ایک بڑی مثال

تقلید شخصی کی ایک واضح مثال عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کا واقعہ ہے، حضرت عثمان غنیؓ نے باجماع صحابہؓ قرآن کے سات لغات یا سات حروف میں سے صرف ایک حرف کو مخصوص کیا، اگرچہ ساتوں حروف قرآن ہی کے تھے اور جبریل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوتے مگر جب قرآن مجید عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑھنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہؓ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت یا حرف میں قرآن لکھا اور پڑھا جائے۔ انہوں نے اسی ایک حرف کے مطابق بہت سے نسخے لکھوا کر اطرافِ عالم میں بھجوائے اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی دوسرے حروف حق نہیں تھے بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن کی خاطر ایک لغت کو اختیار کیا گیا۔[3] اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں، اور تقلید شخصی بدعت نہیں کیونکہ عثمانؓ کا واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر امت کو کسی معاملہ میں کئی امور کا اختیا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۸ مطبوعہ مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر کتاب قبلہ باب ۶ فصل ۷۔

[2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۴ باب حکایہ اہل الناس قبل المائۃ الرابعۃ وبعدہا۔

[3] اس مسئلہ کی پوری تحقیق حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب علوم القرآن میں ملے گی۔

[4] تفسیر معارف القرآن ص ۳۳۵ ج ۵ مع تفسیر لیسیر

علما ہو تو زمانے کے فساد کے پیش نظر ان میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرکے باقی طریقوں کو چھوڑ سکتی ہے اور تقلیدِ شخصی کے معاملہ میں اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

ائمہ اربعہ کی خصوصیت

اب سوال یہ کہ مجتہدین تو بہت سے گزرے ہیں مثلاً سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، اسحاق بن راہویہؒ، امام بخاریؒ، ابن ابی لیلیؒ، ابن شبرمہؒ، حسن بن صالحؒ وغیرہ وغیرہ پھر ان چار اماموں کی کیا خصوصیت ہے؟ کسی بھی مجتہد کو تقلید کے لئے مقرر کر سکتے ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ ان حضرات کی تقلید نہ کرنے کی وجہ ایک مجبوری ہے اور وہ یہ کہ ان کے مذاہب مدوّن شکل میں محفوظ نہ رہ سکے، اگر ان حضرات کے مذاہب بھی ائمہ اربعہ کے مذاہب کی طرح مدوّن و مرتب ہوتے تو بلاشبہ ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے اختیار کیا جا سکتا تھا لیکن نہ تو ان حضرات کے مذاہب کی مفصل کتابیں مدوّن ہیں نہ ان کے مذاہب کے علماء پائے جاتے ہیں، اس لئے ان کی تقلید ناممکن بن گئی ہے، اگرچہ صحیح اعتقاد یہی ہے کہ یہ سب حضرات ائمہ ہدایت پر ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر طویل بحثیں کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) شریعت کو سمجھنے کے لئے اسلاف پر اعتماد کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن سلف کے اقوال پر اعتماد اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ صحیح اور مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں یا صحیح سند کے ساتھ ہم تک پہنچے ہوں، نیز بعد کے علماء نے ان کی تشریح و توضیح کی خدمت کی ہو، اگر ان اقوال میں کئی معانی کا احتمال ہو تو ان پر بحث کر کے راجح معنیٰ کو متعین و مقرر کیا گیا ہو، بعض مرتبہ کسی فقیہ کا قول بظاہر عام ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی خاص صورت مراد ہوتی ہے اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مذہب کے علماء نے ایسی صورتوں کو واضح کر دیا ہو اور اس کے احکام کی علتیں بھی بتادی ہوں جب تک کسی مجتہد کے مذہب کے بارے میں ایسا کام نہ ہوا ہو، اس پر اعتماد کرنا درست نہیں اور یہ صفات ہمارے زمانے میں مذاہب اربعہ کے سوا کسی مذہب

میں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اتبعوا السواد الاعظم۔ یعنی سوادِ اعظم (علما کی جماعت کثیر) کی پیروی کرو۔

جب ان چار مذاہب کے سوا دوسرے برحق مذہب نابود ہو گئے تو اب انہی چار مذاہب کا اتباع سوادِ اعظم ہے۔

(۳) اگر مذاہب اربعہ سے باہر بھی کسی مجتہد کے قول پر فتویٰ دینے کی اجازت ہو جائے تو خواہشات نفس سے مغلوب علماء سُو۔ اپنے کسی بھی فتویٰ کو سلف کے کسی مشہور عالم کی طرف منسوب کر دیں گے کہ یہ بات فلاں امام کے فلاں قول سے ثابت ہے۔ جس امام کے اقوال کی تشریح میں علماء حق کی ایک کثیر تعداد مصروف رہتی ہے اس کے مذہب پر عمل کرنے میں تو خطرہ نہیں۔ لیکن جہاں یہ بات نہ ہو بلکہ کسی مجتہد کے اکا دکا اقوال ملتے ہوں وہاں گمراہی کا سخت اندیشہ ہے۔ کیونکہ لوگ اس مجتہد کی بات کو غلط معنی پہنا کر اس سے من مانے نتائج نکال لیں گے۔[1]

ایک عجیب اعتراض کا مدلل جواب

بعض حضرات نے اس بات پر کہ تقلید شخصی سے خواہش پرستی کا دروازہ بند کرنا ہے پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "پاکستان میں اکثریت حضرات احناف کی ہے اور جتنے رقص و سرود کے کلب موجود ہیں ان کے منتظم حنفی حضرات ہیں، اگر تقلید شخصی ہوا پرستیوں کا علاج ہے تو آج ہوا پرستیوں کے یہ محفل جا بجا کیوں موجود ہیں"؟

اس کے جواب میں ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی کھلی نافرمانی کا عزم کر لیا ہے اور گناہ کو گناہ سمجھنے کے باوجود خواہش پرستی کی وجہ سے اس کا مرتکب ہو رہا ہے، اس کا علاج نہ تقلید میں ہے اور نہ ترکِ تقلید میں۔ یہاں یہ خواہش پرستی زیرِ بحث نہیں بلکہ یہاں گفتگو اس سنگین خواہش پرستی کی ہو رہی ہے جس نے آج سود، شراب، قمار، بے پردگی اور دنیا بھر

---

[1] عقد الجید ص ۳۱ تا ۳۳۔

کے منکرات کو شرعی طور پر قرآن و سنت سے حلال ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی
کا زور لگا رکھا ہے۔ آج پورا عالم اسلام اس تجدد اور اباحیت پسندی کی لپیٹ میں ہے
جس نے اجتہاد اور آزادیٔ فکر کے نام پر دین کو ختم کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ یہ لوگ
قرآن و حدیث کے حوالوں سے مضامین لکھتے ہیں، اور حرام و ناجائز کو حلال اور جائز ثابت
کرنے کے لئے علمی ادارے قائم کر رکھے ہیں، یہ سب حضرات تقلید شخصی کو حرام قرار دے
کر ہی آگے بڑھے ہیں، ان کا پہلا وار اس تقلید پر ہوا ہے جس نے اس قسم کے اجتہادات
کا راستہ روک رکھا تھا اور ان کو سب سے زیادہ مدد اسی پروپیگنڈے سے ملی ہے کہ
ائمہ کی تقلید حرام اور شرک ہے اور اسلام نے تقلید کی بجائے آزادیٔ فکر کا درس دیا ہے
ان صاحبوں نے ہمارے ان اسلاف کی دوربین نگاہوں کی پوری پوری تصدیق کر
دی ہے جنہوں نے نفس پرستی کے سدِ باب کے لئے تقلید شخصی کو لازم کیا تھا۔ جب
تک عالم اسلام میں تقلیدِ شخصی کا رواج تھا اس وقت تک دین کے قطعی احکام اور مسلّمہ
مسائل کبھی ملحدین کی تحریف کا نشانہ نہیں بنے تھے لیکن جب سے یہ پروپیگنڈہ شروع
ہوا ہے کہ تقلید حرام و شرک ہے تو اجتہاد کے نام سے ہر شخص نے قرآن سنت پر
مشق ستم شروع کی ہے اور اس پروپیگنڈے کے بعد سے لے کر آج تک جتنے گمراہ
اور ملحد فرقے سامنے آئے ہیں، ان میں سے اکثر نے اپنی مشق کا آغاز اس خود رائی اور
ترکِ تقلید سے کیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات غیر مقلد علماء کو بھی محسوس ہوتی ہے، چنانچہ
مشہور غیر مقلد عالم جناب مولانا قاضی عبدالواحد صاحب خانپوریؒ اس خود رائی پر غصہ ہو
کر تحریر کرتے ہیں، پس اس زمانے کے جھوٹے اہل حدیث مبتدعین مخالف سلف صالحین
جو حقیقت ما جاء الرسول سے جاہل ہیں وہ صفت میں وارث اور خلیفہ ہوتے ہیں،
شیعہ و روافض کے یعنی جس طرح شیعہ پہلے زمانوں میں باب و دہلیز کفر و نفاق کے تھے
اور مدخل (دروازہ) ملاحدہ اور زنادقہ کے تھے اسلام کی طرف اسی طرح یہ جاہل بدعتی
اہل حدیث اس زمانے میں باب اور دہلیز اور مدخل ہیں، ملاحدہ اور زنادقہ منافقین کے
مثل اہل تشیع کے الی ان قال مقصود یہ کہ رافضیوں میں ملاحدہ تشیع ظاہر کرکے حضرت

علی اور حسنین رضی اللہ عنہم کو غلو کے ساتھ تعریف کر کے، سلف کو ظالم کہہ کر گالی دے دیں اور پھر جس قدر الحاد و زندقہ پھیلائیں کچھ پرواہ نہیں۔ اسی طرح ان جہال بدعتی کاذب اہل حدیثوں میں ایک دفعہ رفع یدین کرے، تقلید کا رد کرے اور سلف کی ہتک کرے مثل امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی، جن کی امامت فی الفقہ اجماع امت سے ثابت ہے، اور پھر جس قدر کفر اعتقادی اور الحاد اور زندیقیت ان میں پھیلا دے بڑی ہی خوشی سے قبول کرتے ہیں، اور ایک ذرہ چین بچیں بھی نہیں ہوتے۔ اگرچہ علماء اور فقہاء اہل سنت ہزار دفعہ ان کو متنبہ کریں ہرگز نہیں سنتے۔ سبحان اللہ تعالیٰ ما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ اور بھیر (راز) اس کا یہ کہ وہ مذہب و عقائد اہل السنت والجماعت سے نکل کر اتباع سلف سے مستنکف (یعنی سلف کو حقیر سمجھ کر ان کی اتباع سے روگردانی کرنے والے) و متکبر ہو گئے ہیں۔ فاتھم وتدبر الی ان قال۔ پھر ملاحدہ مرزائیہ قادیانیہ نکلے تو انہوں نے بھی انہی کے باب اور دہلیز اور مدخل سے داخل ہونا اختیار کیا اور جماعات کثیرہ کو ایمان سے مرتد اور منافق بنایا۔ اور جب زنادقہ چکڑالویہ نکلے تو بھی انہی کے دہلیز و دروازہ سے داخل ہوئے اور ایک خلق کو ان سے مرتد بنایا اور جب یہ ......
خاتمۃ الملحدین نکلا تو بھی انہی جہال اہلحدیث کے باب اور دہلیز سے داخل ہو کر کیا جو کچھ کیا یعنی پہلے اس نے سد متین اور حصن حصین اسلام کا اجماع امت مرحومہ اور اتباع سلف صالحین ہے کہ خیر القرون ہیں اس کو توڑا۔ پھر اسلام میں کفر و نفاق کو داخل کیا اور تحریف کلام الٰہی و قرآن مجید کی، مذاہب ملاحدہ زنادقہ کی طرح ایسی کی کہ ان سے بھی بڑھ گیا اور الحاد جہمیہ اور جبریہ اور کفریات فلاسفہ دہریہ کو اسلام میں بذریعہ مکر و فریب اور تحریف کے داخل کیا الخ بلفظہ (کتاب التوحید والسنت فی رد اہل الالحاد والبدعۃ ص ۲۶۲، ۲۶۳)

اسی طرح مشہور غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے پچیس سالہ تجربے کے بعد فرماتے ہیں کہ پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق (ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں)، اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر و ارتداد کے اسباب اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر

دینداروں کے بے دین ہوجانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترکِ تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔ گروہ اہلحدیث میں جو بے علم یا کم علم ہوکر ترکِ مطلق تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں، اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہوجاتے ہیں (اشاعۃ السنۃ ۱۸۸ جلد اول)

تقلید کے درجات

تقلید کی حقیقت اور تقلیدِ شخصی کا ضروری ہونا تو ثابت ہو چکا، اب ایک ضروری بات یہ ہے کہ فقہاء نے تقلید کرنے والوں کے کچھ درجات کی تشریح کی ہے۔

(۱) ا۔ پہلا درجہ عوام کی تقلید کا ہے، عربی زبان نہ جاننے والے، اسلامی علوم سے بالکل ناواقف، خواہ دوسرے علوم و فنون میں بہت ماہر اور تعلیم یافتہ ہوں،

(۲) ایسے لوگ جو عربی جانتے ہوں اور عربی کتابیں پڑھ سکتے ہوں لیکن تفسیر حدیث و فقہ وغیرہ علوم باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھے ہوں،

(۳) ایسے حضرات جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل ہوں لیکن علوم دین کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت سے عاری ہوں۔

یہ سب لوگ عوام میں داخل ہیں، اس قسم کے لوگوں کے لئے تقلیدِ محض کے سوا کوئی چارہ نہیں، کیونکہ یہ لوگ براہ راست کتاب و سنت کو نہیں سمجھتے اور نہ احکام کے دلائل میں تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکتے ہیں تو وہ کسی امام کا دامن ضرور پکڑیں گے۔

(ب) دوسرا درجہ متبحر عالم کی تقلید کا ہے، ایسا آدمی جو کہ درجہ اجتہاد تک نہ پہنچا ہو اگرچہ اسلامی علوم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے عرصہ دراز تک ان کی درس و تدریس اور تصنیف کی خدمت میں فقہاء کے زیرِ نگرانی مشغول رہا ہو، اس قسم کا عالم مذہب کے دلائل سے بھی واقف ہوتا ہے اور بحیثیت مفتی اپنے مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے اور عرف کے مطابق کسی ایک قول کو اختیار کرنے یا مذہب کی تشریح کرنے کا اہل ہوتا ہے۔

(ج) تیسرا درجہ مجتہد فی المذہب کی تقلید ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو استدلال اور استنباط کے بنیادی اصولوں میں کسی مجتہدِ مطلق کے پیرو ہوتے ہیں، لیکن جزوی

مسائل کو براہِ راست قرآن وسنت اور آثارِ صحابہؓ سے اخذ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ایسے حضرات اپنے امام سے فروعی احکام میں اختلاف رکھ سکتے ہیں لیکن اصولاً وہ مقلد ہی ہوتے ہیں، مثلاً فقہ حنفی میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ، فقہ شافعیؒ میں امام مزنیؒ اور امام ابو ثورؒ، فقہ مالکی میں ابن القاسمؒ اور فقہ حنبلی میں ابراہیم الحربیؒ وغیرہ۔

(۵) آخری درجہ مجتہدِ مطلق کا ہے، وہ شخص جس میں تمام شرائطِ اجتہاد پائی جاتی ہوں یعنی وہ اپنے علم وفہم کے ذریعے اصولِ استدلال بھی خود قرآن وسنت سے اخذ کرنے پر قادر ہو اور ان اصول کے تحت تمام احکامِ شریعت کو قرآنِ کریم سے مستنبط بھی کر سکتا ہو جیسے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ۔ یہ حضرات اگرچہ اصول وفروع دونوں میں مجتہد ہوتے ہیں لیکن ایک طرح کی تقلید ان کو بھی کرنی پڑتی ہے، جن مسائل میں قرآن وسنت میں کوئی تصریح نہیں ہوتی وہاں یہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قیاس اور خالصۃً اپنی رائے کی بجائے صحابہؓ یا تابعینؒ کے کسی قول کی تقلید کریں۔

بہرکیف جس طرح عام آدمی اپنے ملک کا قانون براہِ راست نہیں سمجھ سکتا اور کسی ماہرِ قانون کا مشورہ لیتا ہے اسی طرح عام لوگوں کو اپنے امام کی تقلید ضروری ہے اگرچہ وہ بظاہر کہیں کسی حدیث کو فقہ سے متعارض پائیں کیونکہ وہ احادیث کی تطبیق کو نہیں سمجھتے

تقلیدِ جامد کی مذمت

ایک ضروری بات یہ ہے کہ شریعت کے احکام میں خود رائی اور تقلید کی مخالفت قبیح ہے اسی طرح تقلید میں جمود اور مبالغہ بھی بُرا ہے اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً ائمہ مجتہدین کو نعوذ باللہ شارع یا انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم سمجھنا۔

لے بعض علماء کے نزدیک امام ابو یوسف وامام محمد وامام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ اجتہادِ مطلق کے منصب پر فائز ہیں، انہوں نے اصول میں بھی اپنے استاذ سے اختلاف کیا چونکہ قواعد اور اصول بہ نسبت فروع وجزئیات کے قلیل ہیں، اس لئے اصول میں اختلاف اتنا نمایاں نہ ہو سکا جتنا کہ فروع میں ہوا تقریباً ان حضرات کا اختلاف حضرت امامؒ سے ایسا ہے جیسا کہ خود امامؒ کا اختلاف اپنے استاد حضرت حمادؒ یا اس کا استاد حضرت ابراہیم نخعیؒ سے ہے جیسا کہ بعض اہلِ تحقیق نے ذکر کیا۔

(۲) کسی صحیح حدیث پر صرف اس لئے عمل نہ کرنا کہ اس بارے میں ہمارے امام سے کوئی حکم ثابت نہیں۔

(۳) کسی متبحر عالم کو یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ امام کا قول صحیح حدیث کے خلاف ہے اور حدیث کے مقابل کوئی دلیل نہیں، پھر بھی حدیث کو قابل عمل نہ سمجھنا یہ بھی تقلید جامد میں شامل ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ امام کا قول حدیث کے خلاف ہے اور اس پر اس سے بڑھ کر قوی دلیل موجود نہیں بڑا دشوار امر ہے اور یہی منزلۃ الاقدام میں سے ہے خصوصاً آج کل جب کہ نفسانی خواہشات کا زور ہے اور اکثر لوگ دین سے لاتعلق چند اردو کے رسالے پڑھ کر یا زیادہ سے زیادہ قرآن و حدیث کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کر اپنے آپ کو اس بات کا حق دار سمجھنے لگ گئے اور مسائل میں مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کر کے اس صحیح حدیث کے مصداق بن گئے ہیں کہ "ضلّوا واضلّوا" وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کرام کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس کے لئے بھی چند معقول شرائط مقرر کی ہیں، تاکہ دین نفس پرستوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر نہ رہ جائے وہ شرائط یہ ہیں:

(۱) وہ عالم ایسا شخص ہو جو اگرچہ رتبہ اجتہاد تک نہیں پہنچا ہو لیکن اسلامی علوم کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرنے کے بعد علوم کی تدریس و تصنیف کی خدمت میں اکابر علماء کی زیر نگرانی عرصہ دراز تک مشغول رہا ہو، تفسیر، حدیث، فقہ ان کے اصول سے مستحضر ہو اور کسی کی تحقیق میں اسلاف کے افادات سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہو اور ان کے طرز تصنیف و استدلال سے مزاج شناس ہونے کی بناء پر ان کی صحیح مراد تک

لے مثلاً تشہد میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا بہت سی احادیث سے ثابت ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سنت سے محض اس بناء پر انکار کر دیا کہ امام ابو حنیفہؒ سے اس کے بارے میں کوئی قول منقول نہیں (یہ بعض لوگوں کے زعم کے مطابق تھا) ورنہ اس مسئلے میں امام اعظم کا قول موجود ہے دیکھئے (رفع التردد فی عقد الاصابع عند التشہد للعلامۃ ابن عابدین رحمۃ اللہ)

پہنچ سکتا ہو۔

(ب) جس حدیث کی بنا پر وہ امام کا قول ترک کر رہا ہو اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ علماء حدیث کے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی حدیث کی تصحیح میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے، جو حضرات اسے صحیح سمجھتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں اور جو حضرات اسے ضعیف سمجھتے ہیں اسے چھوڑ دیتے ہیں، ایسی صورت میں اگر مجتہد نے اس حدیث کو چھوڑا تو ضعیف قرار دے کر چھوڑا ہے۔

(ج) اس حدیث کے معارض کوئی آیت قرآنی یا کوئی دوسری حدیث موجود نہ ہو۔

(د) اس حدیث کا مطلب بالکل صاف اور واضح ہو اور اس کا کوئی دوسرا اطمینان بخش مطلب نہ نکل سکتا ہو کیونکہ بسا اوقات ایک حدیث میں کئی معنی کا احتمال ہوتا ہے، مجتہد اپنی بصیرتِ اجتہاد سے اس کے ایک معنی کو متعین کر دیتا ہے اور اس کے مذہب کو حدیث کے مخالف نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) پانچویں بات یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح حدیث کی بنا پر جو قول اختیار کیا جائے وہ ائمہ اربعہ کے اجماع کے خلاف نہ ہو۔

(۴) واضح احادیث کو توڑ مروڑ کر اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے لئے ایسی عجیب و غریب تاویلات کرنا جس پر اپنے دل میں بھی شک و شبہ ہو۔

(۵) یہ سمجھنا کہ صرف میرے امام کا مسلک حق ہے اور دوسرے مذاہب نعوذ باللہ باطل ہیں یہ بھی تقلید جامد یا تقلید میں غلو ہے۔

(۶) بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ کے درمیان صرف افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے، حلال و حرام کا اختلاف نہیں مثلاً آمین آہستہ کہی جائے یا زور سے رکوع کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں، ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف پر

لہ ایسا عالم مذہب کے مختلف اقوال میں سے اپنے زمانے عرف کے مطابق ایک قول کو اختیار کرے یا مذہب کی تشریح کرنے کا اہل ہوتا ہے نیز جن مسائل کی تصریح کتب مذہب میں نہیں ہے ان کا جواب مذہب کے اصول و قواعد سے نکالنے کا جواز بھی اس کو حاصل ہے۔

یہ سب طریقے جائز ہیں اختلاف محض افضلیت میں ہے، ان اختلافات کو حلال، حرام کی حد تک پہنچا کر امت میں انتشار پیدا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

(۲) جہاں ائمہ میں جائز و ناجائز کا اختلاف ہے وہاں بھی اختلاف کو علمی حدود کی حد تک رکھنا ضروری ہے اسے جنگ و جدل کا ذریعہ بنانا، ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی، عیب جوئی اور بدگمانی کسی امام کے مذہب میں جائز نہیں۔

متشددین کی خدمت میں گزارش

مسئلہ تقلید پر جو کچھ نقل کیا گیا اس کا مقصد صرف امت مسلمہ کی اکثریت کا نقطہ نظر واضح کرنا تھا بعض حضرات جب توحید و شرک پر کوئی کتاب لکھنے بیٹھتے ہیں تو بعض فروعی مسائل جیسے توسل اور تقلیدِ ائمہ متبوعین وغیرہ میں اختلاف کو کفر اور اسلام کا اختلاف بنا کر اچھے خاصے مسلمانوں کو کفار اور مشرکین کی صف میں لا کھڑا کر دیتے ہیں، بہر حال اگر کسی کو اس نقطہ نظر سے اختلاف ہو تو وہ اپنے موقف پر قائم رہے لیکن ائمہ مجتہدین پر شریعت سازی یا مقلدین پر کفر و شرک کے الزامات عائد کرنا نہایت ہی خطرناک طرزِ عمل ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے، مسلمانوں کی شان و شوکت اور ہیبت و عظمت کو ہمیشہ آپس کی خانہ جنگی نے تباہ کیا ہے اور فروعی مسائل پر لڑائیوں سے ہمیشہ اسلام دشمن لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے، متشدد غیر مقلدین کے لئے مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں کی یہ تحریر مشعلِ راہ ہے۔

ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میں فقط جماعت اہل سنت کو فرقہ ناجیہ جانتا ہوں، حنفی ہوں یا شافعی، مالکی ہوں یا حنبلی، یا ظاہری یا اہلحدیث، یا اہل سلوک اور کسی کے حق میں، ان میں سے گمان بد نہیں رکھتا، اگرچہ مجھ کو یہ بات معلوم ہے کہ ہر گروہ کے اندر ان میں سے کچھ مسائل خلاف دلائل بھی ہیں اور بعض موافق نصوص، بعض حفاظ نے ان کے صحیح اور بعض ضعیف یا مردود ہیں، اس لئے حکم اکثر کو ہے نہ اقل کو، اور ائمہ سلف سے جو عمل بعض احادیث میں متروک ہو گیا ہے اس کے بیس عذر ہیں جو کتاب جلب المنفعت[1] میں لکھے گئے ہیں، ائمہ سلف پر طعن مخالفت سنت کا کرنا انصاف کا خون بہانا ہے

---

[1] ... احادیث کے اعذار کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا رسالہ رفع الملام بھی قابل دید ہے ۱۲

ہاں جو مقلد ان کے بعد وضوح دلیل کتاب وسنت کے تقلید رکتے بحت پر جامد ہیں ان کو خاطی سمجھتا ہوں لیکن گمراہ بحت نہیں جانتا، نہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں نہ معاذ اللہ ان کو کافر کہوں،

مسائل وعبادات ومعاملات میں اختلاف اہل علم مکفر نہیں ہوتا ہے غایۃ مافی الباب یہ ہے کہ خطاء فی الاجتہاد یا خطاء فی الفہم ہوتی ہے جس کو علماء پہچانتے ہیں۔ اللہ سے امید کرتا ہوں کہ اگر قائل وفاعل اس خطاء کا اپنے قصد میں مخلص غیر متعصب تھا اور کسی وجہ قوی سے شبہ میں گرفتار ہو گیا تو وہ خطا اس کی معاف ہو جاوے۔ اور اگر جمود اس خطا پر عمداً براہ نفاق وشقاق خدا اور رسول کے ہے تو محل نہایت کا اندیشہ ہے، لیکن کسی مسلمان راجی وخائف کی نسبت ایسی بدگمانی کرنا کچھ ضروری نہیں ہے، نحن نحکم بالظواہر واللہ اعلم بالسرائر۔[1]

---

[1] اقامۃ المحن بالقاء المحن بحوالہ ماہنامہ فاران مئی ۱۹۶۳ء (تقلید کی شرعی حیثیت)

باب ششم

شِرک کی مذمّت

باب ششم

شرک کی مذمت

انسان فطری طور پر فقیر و محتاج ہے اور زندگی کی ہر مشکل میں فطرۃً ایک اللہ کی طرف مائل اور متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے نفع ونقصان پر اسباب و عوامل کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس لئے انسان اسباب واشیا۔ کو نفع وضرر کا مالکِ حقیقی سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب اس کی توجہ اور میلان مخلوق کی طرف مکمل اور تام جاتا ہے تو اسی کو اپنا رب مان لیتا ہے۔ اس کو مستقل طور پر نافع اور ضرررساں سمجھ کر اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے اس مخلوق سے مدد طلب کرتا ہے اور یہی چیز اس کو غیر اللہ کے آگے سجدہ ریز کر دیتی ہے۔ پھر غیر اللہ سے محبت اور غیر اللہ کی عبادت اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہے۔

اگرچہ ایسا انسان بعض اوقات زبان سے اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس کا دل کبھی ایک اللہ کے ذکر، اس کی حمد وثنا۔ اسے مالک اور متصرف ماننے سے خوش نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ دوسرے جھوٹے معبودوں کے مالک اور متصرف ہونے کا ذکر نہ کیا جاتے۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مشرکین کی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (زمر آیت ۴۵)

جب صرف ایک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بلاشرکت غیرے تمام کائنات کا مختار، مالک اور متصرف ہے تو ان لوگوں کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تب وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

مشرکین کی ایک عام صفت

الغرض مشرکین کے سب گروہوں میں یہ بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے کہ مخلوق میں سے

جس شے کی بھی پرستش یا اطاعت کرتے ہیں دراصل اس چیز کو نفع و نقصان پہنچانے والی خیال کر کے ہی اس کی عبادت کرتے ہیں، یہ عمل ایک عظیم جرم ہی نہیں بلکہ خالق کائنات کے خلاف بغاوت بھی ہے۔ اللہ کی فرماں روائی اور اس کے ملک میں کسی کو شریک کرنا، اس کی بادشاہی میں کسی کو مستقل طور پر متصرف ماننا، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین اور رب العالمین نہ ماننے کے برابر ہے۔ دنیا کے مجازی حکمران سخت سے سخت جرم کو معاف کر دیتے ہیں لیکن باغیوں کے ساتھ نرمی نہیں کرتے جب ان عارضی حکام کی حکومت سے انکار کرنا اتنا بڑا جرم ہے تو پھر خالق کائنات اور مالکِ حقیقی کے باغیوں کا انجام کیا ہو گا؟ سوچ اور عبرت کا مقام ہے کیونکہ کفر و شرک کی حالت میں مرنے والے ہرگز نہیں بخشے جائیں گے۔ ان کی سزا دائمی ہو گی، البتہ کفر و شرک کے سوا دوسرے گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سب قابل معافی ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب اس کے سارے گناہ بخش دے، ارشادِ ربانی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۞ (النساء آیت ۱۱۶)

بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس (جرم عظیم) کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے سوا (جرائم) جو جسے چاہے جتنے ہوں، اور جس نے شریک ٹھہرایا کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۞ (سورۃ الکہف آیت ۱۰۲)

کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنا لیں گے میرے بندوں کو میرے سوا کارساز، بے شک ہم نے جہنم کو کفار کی مہمانی کے لئے تیار کر رکھا ہے۔

جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی مخلوق کے سامنے جھکتا ہے، اللہ جل شانہٗ کی بے نیاز ذات کی طرف سے اس پر حقیقی نصرت و برکت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں

اور یہ شخص کل قیامت کے دن بے کسی، شرمندگی اور رسوائی کی حالت میں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (بنی اسرائیل آیت ۲۲)

نہ ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ پھر تم پشیمان اور خوار ہو کر بیٹھ رہو گے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔ (بنی اسرائیل رکوع نمبر ۴)

(یعنی اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ) ورنہ تم کو دوزخ میں ملامت زدہ اور دھکے دے کر پھینک دیا جائے گا۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنی قوم اور عوام الناس کو کتنی نصیحتیں کی ہوں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے صرف ان اقوال کو بیان فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو فرمائے کیونکہ باپ اپنے بیٹے کو جو نصیحت کرتا ہے وہ سراسر سچائی اور خلوص ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورہ لقمان آیت ۱۳)

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے (چھوٹے) بیٹے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا، شرک بہت بھاری ناانصافی ہے۔

اس سے بڑھ کر ناانصافی کیا ہوگی کہ عاجز مخلوق کو خالق مختار کا درجہ دیا جائے اور اپنی جان پر اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ اشرف المخلوقات ہو کر عاجز مخلوق کے سامنے سربسجود ہو جائے۔

جب نصاریٰ نے پولس کی تعلیمات کے زیر اثر عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور جزو قرار دیا تو قرآن مجید میں ان کے عقیدہ کی تردید یوں نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ

بے شک کافر ہوئے جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ تو مسیح ابن مریم ہے حالانکہ مسیح نے خود یہ کہا کہ اے بنی اسرائیل بندگی کرو تم اللہ کی جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کے ساتھ، حرام کی اس

اَلْجَنَّۃَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (المائدہ آیت ۷۲)

پھر اللہ نے جنت اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور کوئی نہیں بے انصافیوں کا مدد کرنے والا۔

شرک کا انجام

اور جو بدبخت اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز اور حاجت روا مانتے ہیں اور ان سے یہ امید وابستہ کئے ہوتے ہیں کہ جب ان پر کوئی آفت آئے گی تو وہ (جھوٹے معبود) انہیں بچا لیں گے۔ ایسے لوگوں کی مثال کو اللہ تعالیٰ نے کس خوبی سے بیان فرمایا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚۖ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔

(سورۃ العنکبوت آیت ۴۱)

ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی بنا لئے ہیں مکڑی جیسی ہے کہ بنایا اس نے جالے کا گھر اور (تم سب جانتے ہو کہ) سب گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش ان کو سمجھ ہوتی۔

ان کی توقعات مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ وہ تو ہوا کے جھونکے کو بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ باد و باراں یا طوفان سے ان کی حفاظت کرے پس جو بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو بچانے والا اور محافظ سمجھے گا اور اللہ تعالیٰ سے تعلق توڑ کر غیروں کے ساتھ تعلق جوڑے گا یا ان پر بھروسہ کرے گا۔ ان کی مثال اسی نادان مکڑی کی سی ہے جو اپنے جالے کے تاروں پر بھروسہ کرتی ہے اور امیدوں کے محلات تعمیر کرنا چاہتی ہے۔

بلاشبہ خالق کائنات کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنا لینا اور اسے اپنا کارساز سمجھنا انتہائی بدبختی اور حماقت ہے۔ کائنات میں موجود مخلوقات اور مصنوعات میں جب کوئی عاقل غور و فکر کرتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ عالم کا پیدا کرنے والا، باقی رکھنے والا اور اس میں ہر قسم کے تصرفات کرنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے۔ اس کے دست قدرت میں سارے آسمان و زمین ہیں۔ ہر چیز، فرشتے، سورج و چاند اور جن و انس سب اپنی ذات اور کمالات میں ہر دم اسی کے محتاج اور دست نگر ہیں، پس عبادت

کے لائق بھی بجز اس کے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام اور ادیان سماویہ توحید کی صحت اور شرک کے غلط اور باطل ہونے پر متفق ہیں۔ اب بھی ان تحریف شدہ کتب یعنی تورات، انجیل زبور اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے صحائف میں ایسے جملے بکثرت ملتے ہیں جن سے انبیاء علیہم السلام کا ایک اللہ کی بندگی اور عبادت کرنا اور اپنی اقوام اور امتوں کو ایک اللہ کی عبادت اور اسی پر بھروسہ کرنے کی دعوت دینا ثابت ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اقوال اور اعمال سے واضح کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی اور کی بات کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ ہر نبی کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کی عبادت بھی کرے تو اس کی تمام نیکیاں ضائع ہو جائیں گی، اور شرک کا انجام حرمان و خسران کے سوا کچھ نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (المومنون آیت ۱۱۷)

جو کوئی پکارے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بے شک کامیاب نہیں ہوں گے انکار کرنے والے۔

اور سورہ انعام میں فرماتے ہیں۔

ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

(سورۃ الانعام آیت ۸۸)

یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اس پر چلاتا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتے ان سے وہ اعمال جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔

اسی طرح سورۃ زمر میں ارشاد ہے کہ:۔

وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ

بے شک وحی کی گئی ہے تجھ کو اور جو تجھ سے پہلے تھے کہ اگر (بالفرض محال) تو نے بھی شرک مان لیا

وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

(الزمر آیات ۶۵ تا ۶۷)

تو ضائع ہو جائیں گے تیرے اعمال اور تم بھی نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ ہی کی عبادت کر اور ہو جا شکر کرنے والوں میں سے اور نہیں پہچانی انہوں نے اللہ کی قدر جیسے کہ حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا، اور اس کی شان تو ایسی عظیم ہے کہ زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوتے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ سے۔ وہ پاک ہے ہر عیب سے اور بہت بالاتر (اونچا) ہے اس سے جو کہ اس کا شریک بتلاتے ہیں۔

حدیث شریف میں شرک کی مذمت

اگرچہ شرک کی نفی اور مذمت میں بہت سی احادیث ہیں لیکن یہاں صرف تین احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

یا رسول اللّٰہ ای الذنب اکبر عند اللّٰہ؟ قال ان تدعوا للّٰہ ندا وھو خلقک

(الحدیث متفق علیہ مشکوٰۃ باب الکبائر)

اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ کون سا ہے؟ فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔

(۲) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اجتنبوا السبع الموبقات قالوا! ماھن یا رسول اللّٰہ؟ قال الشرک باللّٰہ، والسحر، وقتل النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق، واکل الربوا واکل مال الیتیم، والتولی یوم الزحف

کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے رسول اللہ وہ کیا ہیں؟ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق قتل کرنا، سود کھانا اور یتیم کا مال کھانا اور لڑائی کے دن پیٹھ پھیر کر جنگ سے بھاگنا اور ایماندار

وتحذف المحصنات المؤمنات الغافلات (متفق علیہ) پاکدامن بے خبر عورتوں پر تہمت لگانا۔

(۳) اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس باتوں کے ساتھ وصیت کی ہے۔

قال لا تشرک باللہ شیئا وان قتلت او حرقت۔ الحدیث (رواہ احمد مشکوٰۃ) فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اگرچہ تجھے قتل کردیا جائے یا تو جلا دیا جائے۔

مشرکانہ عقائد کے اثرات

حقیقت یہ ہے کہ مشرکانہ عقائد ایسے کثیف اور دبیز پردے ہیں جو ہمیشہ صاحب عقیدہ اور اصل حقیقت کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں، اور مشرک حقائق کے دریافت کرنے سے محروم ہو جاتا ہے، جب ایک شخص کوئی غلط عقیدہ مان لیتا ہے تو اس کی عقل اور فکر اسی عقیدہ پر جمی رہتی ہے، اور اس کے افکار کی ترقی اور جدوجہد رک جاتی ہے، پھر وہ بہت سے خرافات کو مان لیتا ہے اور حقیقی کمالات سے دور، ذلت اور پستی کے گڑھے میں گر جاتا ہے، اس کی ساری زندگی وحشت، اوہام اور خوف و ہراس کی نذر ہو جاتی ہے، حیوانات کی معمولی سی حرکت اور پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سے اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے، غلط تصورات کی بدولت وہ دنیوی زندگی میں خوشحالی کے کافی وسائل سے محروم ہو جاتا ہے، اور آخرت میں بھی دائمی عذاب اور پریشانی میں گرفتار رہے گا۔

صحیح راستہ

اس لئے ہر شخص (خواہ انس ہو یا جن) پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرے، اسی ذات کو خالق کائنات، رب العالمین مانے، وہی ہمارا پیدا کرنے والا، ہمارے مصائب و مشکلات کو دور کرنے والا، ہماری حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے، ہماری عزت و ذلت، مرنا جینا، اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہی علیم و خبیر، عالم الغیب والشہادۃ اور کائنات کی تمام حقیقتوں کو جاننے والا ہے، وہی ذات ہے جس کے علم نے کائنات کے ہر ذرے کا احاطہ کیا ہوا ہے، کائنات کی ہر چیز کے ظاہر و باطن ہر آن دیکھنے اور جاننے والا ہے، کائنات

کا کوئی ذرہ مخلوقات کا عمل وقول کوئی سوچ، وسوسہ اور راز کی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں۔ (آل عمران آیت ۵)۔

نیز ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ تمام مخلوق خواہ انس یا جن، فرشتہ ہو یا نبی مرسل ہجالی ہو یا ولی، بادشاہ ہو یا فقیر، حاکم ہو یا محکوم، جاندار ہو یا بے جان سب کو اس کے محتاج و غلام جان لیں ہر طرف سے کٹ کر صرف ایک اللہ تعالیٰ کے وفادار اور شکر گزار بندے بنیں اس کی عظمت اور جلال کو سمجھیں، اس کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔ اور اپنی عبادات کو ہر قسم کی مشرکانہ آمیزش سے پاک کر کے دل وجان سے اس کی عبادت کریں اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔

بندے پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب حاصل کرنے کے لئے یا سفارشی بنانے کے لئے بھی کسی مخلوق کی عبادت نہ کرے اور نہ ہی عبادت کی شکل وصورت اختیار کرے۔ کفار و مشرکین کا یہی طریقہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے اور جب انہیں ٹوکا جاتا تو جواب میں کہتے کہ بے شک بڑا خدا تو ایک ہی ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے ہیں۔ لیکن ہم ان چھوٹے خداؤں کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ ہم خدائے واحد کے قریب ہو جائیں۔ اور کبھی کہتے کہ یہ اصنام اور بت ہماری عبادت سے خوش ہو کر بڑے خدا کے حضور میں ہماری سفارش کریں گے اور ہماری عبادتیں اور دعائیں وہاں تک پہنچا دیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔

(سورہ یونس آیت ۱۸)

اور یہ مشرک عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو (عبادت نہ کرنے کی صورت میں) نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ (عبادت کرنے کی صورت میں) نفع دے سکتی ہیں اور کہتے ہیں یہ (معبود) تو ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے نزدیک (اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ط وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ م مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی ط اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ (سورہ الزمر آیت ۳)

خبردار اللہ ہی کے لئے (شرک و ریا سے) خالص بندگی ہے اور جن لوگوں نے بنا لئے ہیں اس کے سوا اور حمایتی اور کہتے ہیں ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے مگر محض اس لئے کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کر دے گا ان میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے ہیں، البتہ اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو ہو جھوٹا حق نہ ماننے والا۔

ان آیات میں یہی بتایا گیا ہے کہ مشرکین بتوں کی عبادت، ان کو خالق و مالکِ حقیقی سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق و مالکِ حقیقی اور کائنات میں متصرف مانتے تھے، لیکن قربِ الٰہی، دعاؤں اور عبادات کو اللہ تک پہنچانے کے لئے اصنام اور بزرگ ہستیوں کی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ اسی لئے مشرکین ٹھہرائے گئے اور توحیدِ خالص سے محروم ہو کر دائمی خسارے میں پڑ گئے۔

البتہ دعا کی درخواست کے لئے علماء کرام اور صالحین کی خدمت میں حاضر ہونا اس سے بالکل جدا ہے۔ کیونکہ جب کوئی مسلمان کسی اللہ والے صالح آدمی سے دعا کی درخواست کرتا ہے تو اس کی عبادت نہیں کرتا، اور مسلمان سے دعا کی درخواست کرنا قرآن و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے جیسا کہ توسل کے باب میں مفصل گزر چکا ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام، اولیاء اور صلحاء سے محبت رکھنا اور ان کی تعظیم و احترام کرنا اس ضمن میں شمار نہیں، اور نہ ہی یہ غیر اللہ کی عبادت ہے بلکہ ہم کو ان ہستیوں سے محبت اور ان کی تکریم و تعظیم کا حکم ہے کہ اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

شرکِ خفی کوئی عبادت یا دینی کام یا نیک عمل اس لئے کرنا تاکہ[1] لوگوں کے دل میں

---

[1] یعنی اگر کوئی نیک عمل لوگوں کو دکھانے کے لئے اس لئے کرتا ہے کہ وہ اسی طرح کا عمل کریں تو اس میں مضائقہ نہیں لیکن ایسا کرنے سے اکثر لوگ بالآخر ایسے ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اپنی ریاکاری کا علم بھی نہیں ہوتا۔

انسان کی وقعت اور قدر و منزلت پیدا ہو جاتے، شرک خفی اور ریا کہلاتا ہے اس کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) کوئی شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو نہ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور نہ ہی آخرت پر لیکن لوگوں کو باور کرائے کہ وہ مسلمان ہے اور بظاہر دینی اعمال بھی کرتا رہے یہ اصل ایمان میں ریا ہے اسے نفاق کہتے ہیں اور اس کے کرنے والے کو منافق۔ یہ جلی اور عظیم شرک سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اس کا ٹھکانا حشر میں دوسرے مشرکین و کفار سے زیادہ سخت اور اس کا ٹھکانہ سب سے نیچے انتہائی خراب اور برا ہے۔

نفاق کی بھی کئی قسمیں ہیں، اول یہ کہ اندر سے اسلام کا بالکل منکر ہے لیکن مسلمانوں میں افتراق و انتشار پھیلانے اور فتنہ برپا کرنے کے لئے خود کو مسلمان ظاہر کرے اور ظاہری فرمانبرداری جیسے نماز وغیرہ ادا کرے۔ دوم یہ کہ اندر سے تو صاف منکر ہے لیکن مسلمانوں سے اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے ایمان و اسلام کا اظہار کرے اگرچہ فتنہ انگیزی کا خیال نہ ہو۔ سوم یہ کہ دل سے اسلام کا صاف منکر تو نہ ہو لیکن اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان بھی نہ ہو بلکہ کفر و ایمان کیں متردد اور متذبذب ہو۔ لیکن صرف مسلمانوں کی جماعت میں رہنے کی وجہ سے بظاہر اسلام کا نام لیوا ہو، حب دنیا اور شہوات کے غلبہ نے اس کو ایسا نکما بنا دیا ہو کہ دنیا کی خاطر وہ اسلام اور مسلمانوں کی بربادی اور دین کے مذاق اڑانے کو مباح عمل کی طرح برداشت کر لیتا ہو اور ایسے حالات میں بھی جہاد سے جی چراتا ہو جب کہ اسلام اور مسلمانوں کو اس کی سخت ضرورت ہو۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر ان مختلف قسم کے منافقین کی نشاندہی کی ہے اور ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ	یعنی اس (قیامت کے) دن جب کہ تم مومن مردوں
يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم	اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے
بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن	اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا ان سے کہا
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ	جائے گا آج بشارت ہے تمہارے لئے ایسی جنتوں

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۚ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۚ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۚ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

(سورۃ الحدید آیت ۱۲ تا ۱۵)

کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہی ہے بڑی کامیابی۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں مگر ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی جانب عذاب ہوگا۔ منافق اہل ایمان کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ مومن جواب دیں گے ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں میں ڈال دیا ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے، شک میں پڑے رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی توقعات نے یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ پہنچا اور دھوکا دیتا رہا تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا دغاباز شیطان۔ پس آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے وہی تمہاری خبر گیری کرنے والا ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝

(النساء آیت ۱۴۵)

یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔

(۲) ریا کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان تو ہے لیکن عبادات اور دوسرے خیر کے کام لوگوں کو دکھلاوے اور نام و نمود کے لئے کرے۔ مثلاً لوگوں کے سامنے نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، لیکن اگر پاس کوئی دیکھنے والا نہیں ہے تو نہ نماز ہے اور نہ

زکوٰۃ۔ یہ بھی نہایت خطرناک ہے اور ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

(۳) ریاء کی تیسری قسم یہ ہے کہ فرائض میں تو ریا نہ ہو لیکن اگر کوئی پاس ہو تو نفل نمازوں، صدقات اور دیگر مستحبات کا اہتمام ہو لیکن اگر کوئی نہ دیکھے تو نہ نوافل ہوتے ہیں نہ مستحبات۔ یہ ریا بھی بہت خطرناک ہے۔

(۴) چوتھی یہ کہ تنہائی میں اتنی عبادت یا کار خیر نہیں کرتا جتنی لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے، ایسی عبادت پر بھی شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔

(۵) پانچویں قسم کی ریا یہ ہے کہ جو عبادت اور نیک عمل لوگوں کے سامنے کرتا ہے وہی ان کی غیر موجودگی اور تنہائی میں بھی کرتا ہے لیکن لوگوں کے سامنے زیادہ نشاط مسرت اور حسن ادا سے کرتا ہے، مثلاً کوئی ہمیشہ تہجد پڑھتا ہو لیکن مہمان کے سامنے زیادہ نشاط اور خوبصورت طریقے سے پڑھے اس میں بھی ریا ہے۔ اگرچہ پہلی اقسام سے کم۔ٗ

(۶) چھٹی قسم ریا کی وہ ہے جس میں کسی کی موجودگی یا غیر موجودگی کی پروا تو نہ ہو لیکن یہ چسکا لگا ہوا ہو کہ کسی طرح لوگوں کو میرے نیک اعمال اور باطنی حالات کی خبر ہو جائے اور مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتا ہو۔

(۷) ریا کی ساتویں قسم یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو محض اس لئے ترک کر دے کہ لوگ اسے ریاکاری کا طعنہ دیں گے یا اپنی خفیہ مجلسوں یا اپنے خیال میں اسے ریاکار سمجھیں گے، یہ بھی ریا کی ایک بہت خطرناک قسم ہے کیونکہ یہ شخص بے عملی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنے اخلاص اور بزرگی کا ثبوت مہیا کرنا چاہتا ہے جب کہ دوسرے ریاکار عمل کر کے اپنی نیکوکاری وغیرہ کی شہرت چاہتے ہیں شرک خفی اور ریاء کی کچھ قسمیں اور بھی ہیں جو بہت باریک ہیں لیکن قابل معافی۔

ٗ البتہ اگر کار خیر میں رضا اور خوشنودی تو اللہ کی مقصود ہو اور جب کوئی دیکھنے والا ہو تو نشاط اور حسن ادائیگی بھی نہ ہو مگر طبیعت خوش ہو جاتے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرماتے اور اس عمل کو قبول فرما لے بلکہ اگر اس کو خوشی صرف اس بنا پر ہو کہ الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کو ظاہر فرمایا اور ہمارے برے اعمال اور گناہوں کو پوشیدہ کئے رکھا کیونکہ نیکی کا اظہار کرانا اور گناہوں پر ستاری کرنا قیامت کی رسوائی سے بچاؤ کی علامت ہے۔ اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (ایضاً حاشیہ، کو صفحہ)

جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ ازالۃ الخفاء میں معقل بن یسار ؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا اے ابوبکر! شرک تم میں چیونٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے کہا کہ کیا شرک اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود بنائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ البتہ شرک چیونٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو تم کہا کرو تو اس (شرک) کا قلیل اور کثیر سب جاتا رہے (یعنی معاف ہو جائے) فرمایا کہو۔

اللھم انی اعوذ بك ان اشرك بك وانا اعلم واستغفرك لما لا اعلم (ازالۃ الخفاء ص ۱۲۰ ج ۲)

شرکِ خفی اور ریاء کی مذمت

جو شخص ریا کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین نہیں

بعض لوگ تو ایسے ہیں جو اعمال کرتے اور اپنے اندر کچھ کیفیات محسوس کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال اور اندرونی کیفیات کا اظہار ہو تاکہ لوگوں میں ان کی شہرت ہو لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو محض ظاہری حالت اور کیفیت بڑے لوگوں کی طرح بنا لیتے ہیں اور ایسے اعمال کا اظہار کرتے ہیں جو انہوں نے کئے نہیں ہیں مثلاً کسی نے نفلی روزے نہیں رکھے لیکن ہونٹوں کو خشک رکھے یا کہتا ہے کہ میرا روزہ ہے یا تہجد نہیں پڑھتا مگر ایسی حالت بنا لیتا ہے یا ایسے الفاظ اور اشارے کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا تہجد گزار ہے یا صوفیا کی چند باتیں سیکھ کر انہیں دہراتا ہو تاکہ لوگ اس کو بڑا صوفی اور تصوف کا ماہر سمجھیں یا چند روایات وحکایات سیکھ لے اور انہیں صرف اس لئے بیان کرتا ہے کہ لوگوں پر یہ ثابت کر دے کہ بڑا عالم ہے یا کوئی غمگین اور رونی صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو دین کا بہت بڑا غم ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ ایسی شدید قسم کی ریا اور مکاری ہے جو کسی بھی باحیا انسان سے اس کا صدور ممکن نہیں۔ یہاں یہ خیال رہے کہ یہ چیزیں دوسروں میں تلاش نہ کریں کیونکہ یہ نفل نماز، روزہ، تہجد، ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ کو یاد کرنا اور یاد رکھنا اور دین کا غم وغیرہ تو بہت اہم امور ہیں لیکن صرف ریا کی وجہ سے ریا اور شرک خفی بن جاتے ہیں اس لئے دوسروں کے بارے تو خیال یہی رہے کہ وہ اس کو اچھی نیت سے کر رہے ہیں اور اس کی یہ کیفیت یقینی ہے۔ البتہ اپنے بارے میں ہر وقت بدگمان رہے اپنی جان کا محاسبہ کرے اور اپنی نیت کو خالص تر بنانے کی کوشش کریں اور ریا کے خوف سے کسی عمل کو بھی نہ چھوڑیں یہ بھی شیطان کا دھوکہ ہے۔

رکھتا اگرچہ وہ بظاہر اللہ تعالیٰ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت کو ماننے اور ایمان کا دعویٰ کرے، یا تو اس شخص کا دل یقین سے خالی ہے یا پھر اس کا یقین مخلوق پر ہے اور مخلوق سے اس کو جتنے اجر کی توقع ہے اتنی امید اللہ تعالیٰ سے نہیں یا وہ اللہ تعالےٰ اور مخلوق دونوں سے اجر و داد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین بہت کمزور ہے۔

قرآن و حدیث میں ریاء کی بہت مذمت کی گئی ہے اور اس پر بہت سخت وعیدیں آئی ہیں، جیسا کہ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من صلّٰی یُرائی فقد اشرک۔ — جس نے ریا کی نیت سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔

ومن صام یُرائی فقد اشرک ومن تصدّق یُرائی فقد اشرک۔ — اور جس نے ریا کے ارادہ سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، اور جس نے ریا کی نیت سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا۔

(رواہ احمد مشکوٰۃ باب الریا والسمعۃ)

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا المہاجر مدنی قدس سرہٗ ریا پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

جو عبادت بھی ہو خالص اللہ جل شانہٗ کی رضا کے واسطے ہو، اس میں کوئی فاسد غرض ریا، شہرت، وجاہت وغیرہ ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ اس میں "نیکی برباد گناہ لازم" ہو جاتا ہے۔ احادیث میں بہت کثرت سے اس پر وعیدیں اور تنبیہیں وارد ہوتی ہیں۔

ایک حدیث قدسی میں حق سبحانہٗ و تقدس کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ میں سب شریکوں میں سب سے زیادہ بے پرواہ ہوں، جو شخص کسی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کر دیتا ہے میں اس عبادت کرنے والے کو اس کے بنائے ہوئے شریک کے ساتھ چھوڑ دیتا ہوں (مشکوٰۃ) یعنی وہ اپنا بدلہ اور ثواب اس شریک سے جا کر لے لے مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا ہے وہ اس شریک سے اپنا ثواب مانگ لے اللہ جل شانہٗ شرکت سے بے نیاز ہے (مشکوٰۃ)

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم لوگ دجال کا تذکرہ کر رہے تھے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس کا میں تم پر دجال سے بھی زیادہ خوف کرتا ہوں ہم نے عرض کیا کہ ضرور بتائیں حضورؐ نے فرمایا کہ وہ شرکِ خفی ہے، مثلاً ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے اخلاص سے شروع کی ہے، کوئی شخص اس کی نماز کو دیکھنے لگے، وہ آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے اپنی نماز لمبی کر دے۔

ایک دوسرے صحابیؓ حضورؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف چھوٹے شرک کا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا چھوٹا شرک کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، ریاء ہے ایک حدیث میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جس دن حق تعالیٰ شانہٗ بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ عطا فرمائیں گے، ان لوگوں سے یہ ارشاد ہوگا کہ جن کو دکھانے کے لئے کئے تھے، دیکھو ان کے پاس تمہارے اعمال کا بدلہ ہے یا نہیں (مشکوٰۃ)

قرآن پاک میں بھی حق تعالیٰ شانہٗ کا پاک ارشاد ہے فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (الکہف ع ۱۲) جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور ان کا محبوب و مقرب بننا چاہے) تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں بعضے (دینی) مواقع میں اللہ جل شانہٗ کی رضا کے واسطے کھڑا ہوتا ہوں مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میری اس کوشش کو لوگ دیکھیں، حضورؐ نے اس کا کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوگئی۔

حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں عرض کیا کہ میں صدقہ کرتا ہوں اور صرف اللہ جل شانہٗ کی رضا مقصود ہوتی ہے مگر دل یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہیں۔ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔

ایک حدیث قدسی میں ہے حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کرتا ہے تو میں اس عمل کو سارے ہی کو چھوڑ دیتا ہوں، میں صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لئے ہو۔ اس کے بعد حضورؐ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی۔ ایک اور حدیث میں ہے اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ساجھی کے ساتھ بہترین تقسیم کرنے والا ہوں، جو شخص اپنی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی کردے میں اپنا حصہ بھی اس ساجھی کو دے دیتا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم میں ایک وادی ایسی ہے جس سے جہنم خود بھی چار سو مرتبہ روزانہ پناہ مانگتی ہے، وہ ریاکار قاریوں کے واسطے ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے کہ جُبُّ الحزن سے پناہ مانگا کرو (یعنی غم کے کنویں سے جو جہنم میں ہے) صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس میں کون لوگ رہیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جو اپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں نازل ہوئی (در منثور) قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ الآیۃ (البقرہ ع ۳۶)

اے ایمان والو تم احسان جتا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (برباد کرتا ہے) جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے خرچ کرتا ہے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک چکنا پتھر ہو جس پر کچھ مٹی آگئی ہو اور اس مٹی میں کچھ سبزہ وغیرہ جم گیا ہو پھر اس پتھر پر زور کی بارش پڑ جائے سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے گی اسی طرح ان احسان رکھنے والوں، ایذا دینے والوں اور ریاکاروں کا خرچ کرنا بھی صاف اڑ جائے گا اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (یعنی یہ جو نیکیاں کی تھیں، صدقات دیئے تھے یہ سب ضائع جائیں گے)

اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن پاک میں ریاء کی مذمت فرمائی ہے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کا فیصلہ ہوگا ان میں ایک تو شہید ہوگا اس کو بلایا جائے گا اور بلانے کے بعد دنیا میں جو اللہ جل شانہ کے انعامات اس پر ہوتے تھے وہ اس کو یاد دلائے جائیں گے، اس کے بعد اس سے مطالبہ ہوگا کہ اللہ جل شانہٗ کی ان نعمتوں میں رہ کر تو نے کیا نیک عمل کیا، وہ عرض کرے گا کہ میں نے تیری رضا جوئی میں جہاد کیا حتیٰ کہ شہید ہوگیا (اور تجھ پر قربان ہوگیا) ارشاد ہوگا کہ یہ جھوٹ ہے تو نے جہاد اس لئے کیا تھا کہ لوگ بڑا بہادر بتائیں گے، وہ تجھے بہت بڑا بہادر بتا چکے ہیں (جو غرض عمل کی تھی وہ پوری ہوگئی ہے) اس کے بعد اس کو جہنم میں پھینک دینے کا حکم کیا جائے گا اور تعمیلِ حکم میں اس کو منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

دوسرا شخص ایک عالم ہوگا جس کو بلا کر اللہ جل شانہ کے انعامات اور احسانات جتا کر اس سے بھی دریافت کیا جائے گا کہ اللہ جل شانہ کی ان نعمتوں میں تو نے کیا عمل کیا وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور لوگوں کو سکھایا تیری رضا جوئی میں قرآن پاک پڑھتا رہا، ارشاد ہوگا، یہ سب جھوٹ ہے، یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ لوگ کہیں گے کہ فلاں شخص بڑا عالم، بڑا قاری ہے، سو لوگوں نے کہہ دیا ہے (اور جو مقصد اس محنت سے تھا وہ حاصل ہو چکا ہے) اس کے بعد اس کو بھی جہنم میں پھینکنے کا حکم کیا جائے گا، اور تعمیلِ حکم میں منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص ایک سخی ہوگا جس پر اللہ جل شانہ نے دنیا میں بڑی وسعت فرما رکھی تھی ہر قسم کے مال سے اس کو نوازا تھا، اس کو بلایا جائے گا اور جو انعامات اللہ جل شانہٗ نے اس پر دنیا میں فرمائے تھے وہ جتا کر سوال کیا جائے گا کہ ان انعامات میں تیری کیا کارگزاری ہے، وہ عرض کرے گا کہ میں نے خیر کا کوئی موقع جس میں خرچ کرنا آپ کو پسند ہو ایسا نہیں چھوڑا جس میں آپ کی خوشنودی کے لئے خرچ نہ کیا ہو، ارشاد ہوگا یہ جھوٹ ہے تو نے محض اس لئے خرچ کیا کہ لوگ کہیں گے بڑا سخی شخص ہے سو کہا جا چکا ہے، اس کے بعد اس کو بھی جہنم میں پھینکنے کا حکم ہوگا اور تعمیلِ حکم میں منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں پھینک

دیا جائے گا (مشکوٰۃ بروایۃ مسلم) اس حدیث میں اور اسی طرح اور احادیث میں جہاں ایک شخص کا ذکر آتا ہے اس سے ایک قسم آدمیوں کی مراد ہوتی ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ معاملہ صرف تین آدمیوں کے ساتھ کیا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تینوں قسم کے آدمیوں سے یہ مطالبہ ہوگا اور مثال کے طور پر ہر قسم میں سے ایک ایک آدمی کا ذکر کر دیا۔

ان کے علاوہ اور بھی احادیث میں کثرت سے اس پر تنبیہ کی گئی ہے اور بہت زیادہ اہمیت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ خالص اللہ جل شانہٗ کے لئے کیا جائے اور جتنا بھی اہتمام ہو سکے اس کا کیا جائے کہ اس میں ریا اور نمود و شہرت اور دکھاوے کا شائبہ بھی نہ آنے پائے، مگر اس جگہ شیطان کے ایک بڑے مکر سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے، دشمن جب قوی ہوتا ہے وہ مختلف انواع سے اپنی دشمنی نکالا کرتا ہے، یہ بسا مرتبہ آدمی کو اس وسوسہ کی بدولت کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں اہم ترین عبادتوں سے روک دیا کرتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شیطان اول تو نیک کام سے روکا کرتا ہے اور ایسے خیالات دل میں ڈالا کرتا ہے جس سے اس کام کے کرنے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو، لیکن جب آدمی اپنی ہمت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے روکنے پر عمل نہیں کرتا تو وہ کہا کرتا ہے تجھ میں اخلاص تو ہے ہی نہیں، یہ تیری عبادت، محنت بیکار ہے، جب اخلاص ہی نہیں پھر ایسی عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ اور اس قسم کے وسوسے پیدا کر کے نیک کام سے روک دیا کرتا ہے اور جب آدمی رک جاتا ہے تو اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے (احیاء) اس لئے اس خیال سے نیک کام کرنے سے رکنا نہیں چاہیئے کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں، بلکہ نیک کام کرنے میں اخلاص کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے اور اس کی دعا کرتا رہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے لطف سے دستگیری فرماتے، تاکہ نہ تو دین کا مشغلہ ضائع ہو، نہ برباد ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

(فضائل صدقات حصہ اول صفحہ ۱۶۴، ۱۶۵)

باب ہفتم

محبّتِ مطلوبہ

باب ہفتم

محبت

شرابِ روح پرور ہے محبت ربِ یزداں کی

اللہ رب العزت نے انسان میں ایک مادہ محبت کا ایسا رکھ دیا ہے جس نے اسے ذوق تپش سے آشنا کر دیا ہے، اسی کی برکت سے زندگی کا سوز و ساز ہے اور ہر دم ایک نیا محشر بپا ہے، اسی کی وجہ سے دل مضطرِ سیماب ہے، خود تڑپتا اوروں کو تڑپاتا ہے اور اس کے نالہ ہائے غم آسمان کی بجلیوں سے کھیلتے ہیں۔

محبت کا یہ مادہ انسان کو محبوب کے حصول اور رضا کے لئے جان کی بازی لگانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کی محبت جس چیز سے وابستہ ہو جاتی ہے یہ اس کا غلام و بندہ بن کے رہ جاتا ہے، یہی محبت اس کے تمام امراض، پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب بھی بن جاتی اور علاج بھی۔ اگر محبت دنیائے فانی سے ہو تو انسان آشفتہ حال، آگ بگولہ بن کر دنیا کے حصول کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے، دور دراز ممالک دریافت کرتا ہے دولت و عزت و شہرت حاصل کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کر دیتا ہے۔ اور کبھی حسنِ فانی کا پروانہ بن کر اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیتا ہے۔

محبت اگر اس تغیر پذیر دنیائے بے ثبات سے ہوگی تو انسان ناکام و نامراد ہوگا لیکن اگر یہی محبت جمالِ لازوال سے، اور اس کا سوز و گداز حسن ازلی و ابدی خالق کائنات رب العالمین کے لئے ہو اس کی وفا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہو جائے تو اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول سے ان کی رضا اور احکام کو معلوم کر کے دنیا میں ایمان و عمل سے اُجالا کر دے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت انسان کی ساری پراگندگی اور پریشانی کا حل ہے۔ یہ وہ آبِ حیات ہے جو اس کو بقائے دوام عطا کرتی ہے اور اس کے لئے دنیا و آخرت میں سرمایہ فلاح و نجاح ہے۔

جس طرح مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی محبت ضروری ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ الآیۃ۔ اسی طرح شعائر اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ضروری ہے۔

اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(الاعراف آیت ۱۵۷)

یعنی پس جو لوگ اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے اور اس کی (محبت وتعظیم کے ساتھ) حمایت کی اور (مخالفین کے مقابلہ میں) اس کی مدد کی اور تابع ہوئے اس نور (قرآن مجید) کے جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے وہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے۔

تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ۔

یعنی تم ان کی (محبت وتعظیم کے ساتھ) مدد کرو اور دل سے ان کی تعظیم کرو۔

معلوم ہوا کہ مکمل کامیابی اور فلاح پانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لائے۔ ان کی تکریم وتعظیم میں کوئی کمی نہ کرے، ان کے دین کی نصرت اور اس کی تائید کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو اور قرآن کریم کے ارشادات پر عمل کرنے کے لئے دل وجان سے آمادہ ہو حضرت مولانا مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں

"یہاں فلاح پانے کے لئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں۔ اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، دوسرے آپ کی تعظیم وتکریم، تیسرے آپ کی امداد، چوتھے قرآن کریم کا اتباع۔

تعظیم وتکریم کے لئے اس جگہ عزروہ لایا گیا ہے۔ یہ تعزیر سے مشتق ہے تعزیر کے اصل معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے، حفاظت کرنے کے ہیں، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے عزروہ کے معنی تعظیم وتکریم کرنے کے بتلاتے ہیں، اور مبرد نے کہا

لہ اور جو ایمان والے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

کا اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
آگے لکھتے ہیں۔

"عزروہ ونصروہ۔ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے دنیا کے حکام کا اتباع جبراً و قہراً کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت و محبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو کیونکہ اُمّت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ امیر و حاکم ہے اور اُمّت محکوم و رعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری اُمّت ان کی مُحِب۔ ایک یہ کہ رسول اپنے کمالات علمی عملی اخلاقی کی بنا پر صاحب عظمت ہے اور ساری امت ان کے مقابلے میں پست و عاجز۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجہ کمال میں پائی جاتی ہیں، اس لئے اُمّت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں۔ بحیثیت امیر و حاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالات نبوت ان کی تعظیم و تکریم بجا لائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو اُمّت پر فرض ہونا ہی چاہیئے تھی کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اُمّت پر آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کو بھی لازمی قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے آداب سکھائے گئے ہیں اس آیت میں "عزروہ ونصروہ" کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی "وتعزروہ وتوقروہ" آیا ہے"

(معارف القرآن ج ۳ ص ۸۷)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔
یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ وہ محبت اور تعلق بیان فرما رہے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین سے ہے کہ تمہارے ساتھ ہمدردی و خیرخواہی اور تربیت وغیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر تمہارے نفوس سے بھی زیادہ مہربان ہیں حضور کا لطف و کرم اور تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی اور خیرخواہی کا جو خیال آپ رکھتے ہیں وہ خود تمہارے نفوس بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ما من مؤمن الا وانا اولی الناس به فی الدنیا والاٰخرة اقرؤا ان شئتم اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الحدیث بخاری جلد ۲)
کوئی مومن ایسا نہیں جس کے لئے میں دنیا اور آخرت میں سارے انسانوں سے زیادہ اولیٰ اور اقرب نہ ہوں اگر تمہارا دل چاہے تو اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت پڑھ لو النبی اولی بالمومنین الایہ۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہے اور ہم میں سے ہر ایک پر ساری دنیا سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں تو پھر اس کا لازمی اثر اور حق یہ ہونا چاہیے کہ ہر مومن کو آپ سے محبت تمام مخلوقات اور اپنی جان سے بھی زیادہ ہو، آپ کی تکریم و تعظیم بھی سب سے زیادہ کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی تمام مخلوقات اور نفس کی ساری خواہشات پر مقدم رکھے اور سب سے زیادہ واجب التعمیل سمجھے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ وَ
آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار جس کے بند ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم

تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

(سورۃ التوبہ آیت ۲۴)

پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیارے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں لڑنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم (سزا) اور اللہ ہدایت نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

اپنی اولاد، ماں باپ، بھائی اور اپنی بیوی وغیرہ سے محبت اور تعلق انسانی فطرت کا تقاضا ہے اسی طرح کاروبار، مال اور مکانات وغیرہ کے ساتھ انسان کا لگاؤ اس لئے ہے کہ وہ آرام و چین، عزت و راحت سے زندگی گزارنے میں ان کا محتاج ہے اسلام دین فطرت ہونے کی وجہ سے انسان کے فطرتی تقاضوں اور ضرورتوں کا صحیح اور مناسب خیال رکھتا ہے اور ہمیں ان اشیاء کے نہ حاصل کرنے یا ان کی طرف کامل بے توجہی کا حکم نہیں کرتا، بلکہ صرف ان کی محبت میں کھو جانے سے منع کرتا ہے تاکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر غالب نہ آ جائیں اور احکام شریعت پر عمل کرنے کے خلاف رکاوٹ نہ بن جائیں۔ جہاد و ہجرت جیسے عظیم اعمال کے لئے مانع نہ ہو جائیں۔

اگرچہ ان آیات میں اُن لوگوں سے خطاب ہے جنھوں نے ہجرت و جہاد فرض ہونے کے وقت ان اشیاء کے لگاؤ اور محبت سے مغلوب ہو کر ہجرت و جہاد نہ کیا لیکن آیات شریفہ کے الفاظ عموم کے ساتھ تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس درجہ کی محبت لازم ہے جس پر کوئی دوسری محبت اور تعلق غالب نہ آئے جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بخاری و مسلم کتاب الایمان ج۱ ص ۷،۴۹)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (پورا) مومن نہیں ہوگا جب تک میں اس کو اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔

اسی طرح بہت سی صحیح احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب تک ایک امتی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ نہ ہو اس وقت تک اس کو ایمان کی حقیقت اور لذت نہیں حاصل ہو سکتی۔

محبت کے اسباب

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ محبت کرنے کے چند اسباب ہوتے ہیں، پہلا سبب قرابت ہے اس میں محبت کا سبب صرف قرب ہوتا ہے کسی خارجی چیز جیسے حسن و کمال کی مزید ضرورت نہیں پیش آتی، بلکہ جہاں جتنا قرب ہوتا ہے وہاں اتنی ہی زیادہ محبت ہوتی ہے جیسے والدین کی محبت اولاد سے، دوسرے اقربا سے زیادہ ہوتی ہے اسے طبعی محبت کہتے ہیں۔

محبت کا دوسرا بڑا سبب احسان ہے، یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ محسن سے محبت ہو ہی جاتی ہے تیسرا سبب حسن و جمال ہے، کیونکہ حسن صورت، حسن سیرت اور آواز کا حسن یہ سب اپنے اندر کشش رکھتے ہیں، محبت کا چوتھا سبب کمال ہوسکتا ہے، کسی میں غیرت، شجاعت، دانائی وغیرہ کے کمالات ہوں تو انہیں دیکھ کر یا سن کر صاحب کمال سے محبت ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات محبت کا منشا، صرف عقلی ہوتا ہے اگرچہ طبعی طور پر آدمی کراہت اور گھبراہٹ محسوس کرے، بیمار کو تلخ دوا، آپریشن یا انجکشن وغیرہ سے تکلیف و گھبراہٹ ہوتی ہے مگر عقلاً اس کو صحت یابی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ دوائیں وغیرہ اس کی محبوب و مطلوب بن جاتی ہیں۔

حضور سے اختیاری محبت

چونکہ محبت طبعی ایک اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت اور اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت سے مراد حُب عقلی ہے یعنی یہ بات سوچ سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی محبت لازم ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع ضروری ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے دل میں طبعی دنیاوی تعلقات ہو لیا

لیکن وہ ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی پرواہ نہ کرے تو وہ بھی آیاتِ مذکورہ کی وعید سے خارج ہے اور اللہ و رسول کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے۔ جیسے دوا کی تلخی یا آپریشن سے طبعاً گھبراہٹ قابلِ ملامت نہیں، اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد کی محبت کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کے بجا لانے میں غیر اختیاری تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس تکلیف کو برداشت کر کے وہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے تو وہ قابلِ ملامت نہیں۔

عقلی محبت اختیاری ہوتی ہے لیکن اس پر قناعت کر لینا درست نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی محبت ابتداء میں اختیاری اور عقلی ہوتی ہے لیکن اس میں اس قدر ترقی ہونی چاہیئے کہ یہ محبت طبیعت پر غالب آجائے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی تعمیل میں وہ لذت محسوس ہو جو ہر تکلیف کو راحت اور ہر تلخی کو شیریں بنا دے۔ یہی محبت کا اعلیٰ مقام ہے اور اسی درجہ کی محبت کی ترغیب دی گئی ہے جیسے صحیحین کی ایک حدیث میں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

ثلث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما۔ الحدیث۔	یعنی جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پائے گا ایک یہ کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت سب چیزوں (مخلوق) سے زیادہ ہو۔
(بخاری و مسلم کتاب الایمان)	

اس حدیث شریف میں حلاوتِ ایمان سے مقصود محبت کا یہی درجہ ہے جو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو اور بڑی سے بڑی مشقت، حتیٰ کہ اپنی جان کی قربانی تک کو لذیذ بنا دے۔ اور ہر قسم کی محبت چاہے طبعی ہو یا عقلی پر اس تعمیلِ احکام کو ترجیح دے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اس پر شاہد ہے۔ چند واقعات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی محبت

بنی دینار کی ایک مسلمان خاتون کے والد، بھائی اور خاوند غزوۂ احد میں شریک ہوئے تھے، جب اس کو ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملتی کہ وہ شہید ہو گیا ہے تو وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتی اور بے قراری سے دریافت کرتی رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں، لوگوں نے بتایا کہ آپ بالکل صحیح و سالم ہیں اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگی مجھے بتاؤ تا کہ دیکھ کر یقین کر لوں، جب اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو فرمانے لگیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے تمام مصیبتیں ہیچ ہیں (سیرت ابن ہشام)

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت تھی، آپ نے فرمایا کہ خدائے پاک کی قسم حضور ہم لوگوں کے نزدیک اپنے مالوں سے، اور اپنی اولادوں سے اور اپنی ماؤں سے اور سخت پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے (شفاء، حکایت صحابہ)

(۳) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مولیٰ کیسانؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے، دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ جو کچھ اس میں ہے اسے پی رہے ہیں، اتنے میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضورؐ کی خدمت میں آئے، آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کام کر آئے؟ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا جی ہاں! حضرت سلمانؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا کام؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے ان کو اپنے پچھنے کے خون کا غسالہ دیا تھا تا کہ جو کچھ اس میں ہے بہا دیں، حضرت سلمانؓ نے فرمایا قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اسے تو یہ پی گئے۔ آپ نے پوچھا کیا تم اسے پی گئے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا کیوں؟ انہوں نے عرض کیا مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن زبیرؓ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے

نقصان پہنچے گا۔ یعنی تم شہید کئے جاؤ گے اور تم سے جنگ کرنے والے مبتلائے عذاب ہوں گے تمہیں جہنم کی آگ نہ پہنچے گی مگر وعدہ الٰہی وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا کے پورا کرنے کے لئے ہے (جس کے ایفاء کے لئے پل صراط پر سے گزرنا ہوگا)۔[1]

(۴) اور حضرت سفینہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور فرمایا کہ خون کو درندوں، پرندوں اور انسانوں سے بچا کر کسی جگہ دفن کر دو۔ میں آپ کے پاس سے لے گیا اور پس پردہ اسے پی گیا۔ اس کے بعد میں نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا، حضور ہنس پڑے (رواہ الطبرانی ورجالہ ثقات)

(۵) اسلام کے ابتدائی دور میں جب مکہ مکرمہ کے کفار نے حضرت زید دثنہؓ کو شہید کرنے کے لئے زمین حرم سے نکالا تو ابو سفیان بن حرب نے ان سے کہا میں تجھے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ آج تیری جگہ محمد ہو اور تم اپنے گھر میں مامون و محفوظ رہو؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو بہت بڑی بات ہے خدا کی قسم میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں۔ اس پر ابو سفیان نے کہا میں نے ساری عمر میں کسی کو کسی کے ساتھ ایسی محبت کرنے والا نہیں دیکھا جیسا کہ محمد کے ساتھی محمد سے محبت کرتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم (الشفا۔ ج ۲ ص ۱۹۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۸)

(۶) سلمہ بن اکوعؓ ہمیشہ مسجد نبوی کی اس ستون کے ساتھ شوق کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے جس کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔[2]

اسی طرح سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ان تمام جگہوں پر نوافل ادا کرتے تھے جہاں جہاں ان کے والد عبداللہؓ نے نماز ادا کی تھی کہ ان مقامات پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی۔[3]

(۷) حضرت ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا

---

[1] عند ابی نعیم و اخرجہ ابن عساکر عن سلمان نحوہ مختصرا ورجالہ ثقات کذا فی الکنز ج ۴ ص ۵۶ ۔ ۔ کذا فی مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۷۰ [2] بخاری الصلوات الی الاسطوانۃ [3] بخاری باب المساجد علی طریق المدینۃ۔

کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال (مبارک) ہیں، ہم نے انہیں انس رضی اللہ عنہ سے پایا، یہ کہا کہ انسؓ کے گھر والوں کے پاس سے پایا ہے، تو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ان بالوں میں سے ایک بال بھی مجھے مل جاتے تو ساری دنیا سے اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے وہ مجھ کو زیادہ پیارا ہوگا (بخاری شریف کتاب الوضوء ج ۱ ص ۹۶)

(۸) ایک صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ مجھے اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنی جان و مال سے بھی زیادہ پیارے ہیں، اور میرا یہ حال ہے کہ میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں اور حضورؐ مجھے یاد آجاتے ہیں تو اس وقت تک مجھے صبر اور قرار نہیں آتا جب تک حاضر خدمت ہو کر دیکھ نہ لوں، ایک نظر دیکھ نہ لوں اور جب میں اپنے مرنے کا اور حضورؐ کی وفات کا خیال کرتا ہوں تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وفات کے بعد حضورؐ تو جنت میں پہنچ کر انبیاء علیہم السلام کے بلند مقام پر پہنچا دیئے جائیں گے اور میں اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنت میں گیا بھی تو میری رسائی اس عالی مقام تک تو نہیں ہو سکے گی تو مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میں آپ کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گا۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس بات کا جواب اپنی طرف سے نہیں دیا، یہاں تک کہ سورہ النساء کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (ن، آیت ۶۹ رکوع ۹)

اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے لوگ بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات سب اچھے رفیق ہیں۔

(۹) صحیح حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے قیامت کے لئے کیا تیار کر رکھا ہے؟ انہوںؓ نے عرض کیا کہ میرے ساتھ اس کے سوا کچھ نہیں کہ

لہ رواہ الطبرانی فی الصغیر والاوسط ورجالہ رجال الصحیح غیر عبداللہ بن عمران العابدی وھو ثقۃ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۷۔

ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت رکھتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گے جس سے محبت رکھتے ہو۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم اسلام کے بعد کبھی کسی چیز پر ایسے خوش نہیں ہوتے جتنا کہ حضورؐ کے اس فرمان سے خوش ہوئے (کیونکہ صحابہؓ کو آپؐ سے والہانہ محبت تھی) اس کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ابو بکرؓ و عمرؓ سے محبت رکھتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی اس محبت کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوں گا، اگرچہ میں نے ان حضرات جیسے بہت زیادہ اعمال نہیں کئے ہیں (بخاری باب الاحکام و مسلم کتاب البر والصلۃ واللفظ لہ)

(۱۰) الغرض صحابہ کرامؓ کو آپ کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی، صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، قریش کے سفیر کی حیثیت سے حضور کے سامنے ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طویل گفتگو کرتے رہے، اور نظریں بچا بچا کر صحابہ کرامؓ کے حالات معلوم کرتے رہے واپس جا کر کفار قریش کے سامنے صحابہ کرامؓ کی محبت اور تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

"اے قریش میں بڑے بڑے بادشاہوں کے یہاں گیا ہوں، قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کو بھی دیکھا ہے اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں، خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کی جماعت اس کی ایسی تعظیم کرتی ہو جیسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت ان کی تعظیم کرتی ہے، جب وہ وضو کرتے ہیں تو صحابہ کرامؓ آپ کے بچے ہوئے پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور اگر وہ تھوکتے ہیں تو لپک کر لے لیتے ہیں۔ اور جس کے ہاتھ پر پڑ جاتے اس کو بدن اور منہ پر مل لیتا ہے، اور جب ان کو کسی بات کا حکم فرماتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے سامنے بولتے ہیں تو بہت نیچی آواز سے، ادب کی وجہ سے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے، اگر ان کے سر یا داڑھی کا کوئی بال گرتا ہے تو اس کو تبرکاً اٹھا لیتے ہیں غرض میں نے کسی جماعت کو اپنے آقا کے ساتھ اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت ان کے ساتھ کرتی ہے۔ تو جس قوم کو اپنے سردار سے اتنی محبت ہو اس پر غالب آنا ناممکن ہے (ماخوذ از صحیح بخاری و سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۲۶ ج ۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی اہمیت اور اس کے ثمرات

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ایمان و دین کی روح ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہے گا اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی محبت لازمی اور ضروری ہے کہ وہ ایسے جائز اسباب اختیار کرے جن سے محبت میں ترقی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو فیوض و برکات آپ کے ذریعے پہنچاتے ہیں۔ اس لئے جو کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر اللہ سے محبت کا اظہار کرے وہ بالکل غیر معتبر اور جھوٹا ہے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی عظیم قربانیوں اور اعمال کا اصل محرک یہی جذبہ تھا۔ اللہ اور رسول کی محبت ان کی والہانہ زندگی کا سبب تھا۔ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو دل میں بس جانے کے بعد محبوب کو ہر چیز پر غالب کر دیتی ہے، پھر نہ مال و جان کی پرواہ ہوتی ہے نہ ننگ و ناموس کی اور نہ ہی تکلیف و مشقت کا اندیشہ رہتا ہے الغرض کسی دوسری چیز کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، جب انسان کے دل میں یہ جذبہ محبت جوش مارتا ہے تو پھر شریعت پر پابندی نہایت آسان ہو جاتی ہے اور دینی تکالیف میں راحت محسوس ہوتی ہے اور جذبہ محبت کی آگ دل میں بھڑک اٹھے تو انسان محبوب کے احکام کی تعمیل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اور یہی حالت درحقیقت سچے موحد کی ہے توحید اور محبت کوئی حکایت کی چیز نہیں بلکہ یہ ایک کیفیت ہے موحد اور محب ایسا ایسا ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ مستقل طور پر سوائے محبوب کے کسی اور چیز نہیں جمتی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں کے قلوب میں محبت بھڑکتی رہی ان کا سر دنیا کی کسی طاقت کے سامنے اور کسی در پر نہ جھک سکا۔

حضور کے ادب و احترام کا حکم

درحقیقت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی اطاعت کا حق ادا ہی تب ہو سکتا ہے جب دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت ہو، ورنہ بغیر محبت کے اطاعت ریا اور نفاق ہوتا ہے۔ شریعت مطہرہ میں اسی لئے تعظیم و محبت کو فرض کیا گیا ہے اور جو ذرا بھی توہین کریگا فیض رسالت سے ابدالآباد تک محروم رہے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بولنے اور ان کی آواز پر آواز بلند کرنے کی ممانعت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (سورہ الحجرات آیت ۲)

اے ایمان والو! بلند نہ کیا کرو اپنی آوازوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اور نہ ان کے ساتھ زور سے بات کیا کرو جس طرح اونچی آواز سے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ بے ادبی کی وجہ سے تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اس آیت شریفہ کے اول مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جن کا ایثار اور قربانیاں بے مثال ہیں، جن کی عبادات خشوع و خضوع میں رنگی ہوئی ہیں، جو ہر معاملہ میں اور ہر وقت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی ڈھونڈنے والے تھے۔ انھیں کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آواز اونچی کی تو یہ بھی ایسی بے ادبی اور گستاخی ہوگی کہ تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، اس آیت کے نزول سے صحابہ کرامؓ کا یہ حال ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا جس طرح کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہو (در منثور عن البیہقی) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا (کذا فی الصحاح) اور حضرت ثابت بن قیسؓ قدرتی طور پر بہت بلند

آواز تھے، یہ آیت سُن کر بہت ڈر گئے اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا (بیان القرآن از درمنثور) چند سطر آگے لکھتے ہیں:

اس جگہ کلیاتِ شرعیہ اور اصولِ مسلّمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ حبطِ اعمال یعنی اعمالِ صالحہ ضائع کر دینے والی چیز تو باتفاق اہلِ السنت والجماعت، صرف کفر ہے، کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمالِ صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مومنین اور صحابہ کرامؓ کو ہے اور لفظ یَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر ہونا ثابت ہوتا ہے تو حبطِ اعمال کیسے ہوا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعلِ اختیاری ہے، جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہو سکتا اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ أَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ یعنی تمہیں خبر بھی نہ ہو، تو حبطِ اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوئی۔

سیدی حضرت حکیم الامتؒ نے بیان القرآن میں اس کی توجیہ ایسی بیان فرمائی ہے جس سے یہ اشکالات وسوالات ختم ہو جاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو تم رسول اللہ کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے سے اور بے محابا جہر کرنے سے بچو کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسول سے پیش قدمی یا ان کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر کے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا بھی احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسول کا، اگرچہ صحابہ کرامؓ سے یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذا کا سبب بنے، لیکن اعمال وافعال جیسے تقدم اور رفعِ صوت اگرچہ بقصدِ ایذا نہ ہوں، پھر ان سے ایذا کا احتمال ہے اس لئے ان کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے، اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے کرنے والے سے توبہ اور اعمالِ صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہو کر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبطِ اعمال کا (معارف القرآن ص ۱۰۲، ج۸)

اور ایک آیت میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے وقت ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے عام آدمیوں کی طرح آواز نہ دیا کریں۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (سورہ النور آیت ۶۳)

تم لوگ رسول (کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے بلانے کو ایسا نہ بنالو جیسے تم (آپس میں) ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

اور اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۴)

اے ایمان والو تم (لفظ) راعنا نہ کہا کرو، اور انظرنا کہا کرو اور (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات) توجہ سے سنو، اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اگر آپ کے کسی ارشاد مبارک کو کبھی اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو عرض کرتے یا رسول اللہ راعنا یعنی ہماری رعایت فرمایئے گا کیونکہ ہم پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں، دوبارہ سمجھا دیجئے لیکن چونکہ یہود کی زبان یعنی عبرانی میں یہی لفظ ایسے معنی رکھتا ہے جس میں گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ ایسے الفاظ سے احتراز کریں جس میں گستاخی کا ادنیٰ شائبہ تک ہو، اور ہر ایسے راستے کو بند کر دیا ہے جس طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت کا رشتہ کمزور ہو سکتا ہو، مثلاً آپ کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے عقد کرنے کو قرآن کریم میں ناجائز قرار دیا کہ ایسی صورت میں دل میں وہ عظمت و لحاظ اور ادب و احترام باقی نہیں رہ سکتا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ضروری ہے۔

صحابہؓ سے محبت

اسی طرح قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف اور مناقب کو نہایت حکیمانہ انداز میں اسی مقصد کے لئے پیش کیا گیا ہے کہ حضورؐ کے ساتھ محبت و تعظیم میں اضافہ ہو۔

کیونکہ کسی ڈاکٹر یا حکیم کی قابلیت کا اندازہ اس کے سپرد کئے ہوئے مریضوں کی حالت

سے لگایا جاتا ہے اور استاذ کا کمال اس کے شاگردوں کی خوبیوں سے پہچانا جاتا ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اور اوصاف اور ان کی تربیت کا صحیح رنگ بھی ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ الآیہ

(سورۃ الفتح آیت ۲۸)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے صحبت یافتہ ہیں (وہ) کفار کے مقابلہ میں سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں (اے مخاطب) تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کرتے ہوئے کبھی سجدہ کرتے ہوئے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے طلب گار ہیں ان کے ایمان اور عبادت کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے آشکارا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۚ

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ سورۃ الحشر آیت ۹

(یعنی مال فئی میں حق) ان حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔

اور ان لوگوں کا حق ہے، جو دارالاسلام اور ایمان میں ان کے قبل قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے وانصار اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے اور اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ (خود) ان پر فاقہ ہی ہو اور جو شخص بخل سے محفوظ رکھا گیا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ سورۃ الحشر آیت ۱۰

اور ان لوگوں کا (حق ہے) جو ان کے بعد آئے (یعنی مہاجرین اور انصار کے بعد) جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے، اے ہمارے رب آپ بڑے شفیق و رحیم ہیں۔

مہاجرین و انصار صحابہ کرامؓ کے مناقب اور اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیعؒ آخر میں فرماتے ہیں،

اس مقام میں حق تعالیٰ شانہٗ نے پوری امت محمدیہ کے تین طبقے کئے، مہاجرین و انصار اور باقی تمام امت۔ مہاجرین و انصار کے خاص اوصاف اور فضائل بھی اس جگہ ذکر فرمائے مگر باقی امت کے فضائل و کمالات اور اوصاف میں سے صرف ایک چیز یہ بتلائی کہ وہ صحابہ کرامؓ کی سبقت ایمانی اور ایمان کے ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہونے کو پہچانے اور سب کے لئے دعائے مغفرت کریں اور اپنے لئے یہ دعا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی مسلمان سے کینہ و نفرت نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے بعد آنے والے جتنے مسلمان ہیں ان کا ایمان و اسلام قبول ہونے اور نجات پانے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ کی عظمت و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہوں، اور ان کے لئے دعا کرتے ہوں جس میں یہ شرط نہیں پائی جاتی وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں، اسی لئے حضرت مصعب بن سعدؓ نے فرمایا کہ امت کے تمام مسلمان تین درجوں میں ہیں جن میں سے دو درجے تو گزر چکے (یعنی مہاجرین و انصار) اب صرف ایک درجہ باقی رہ گیا یعنی وہ جو صحابہ کرامؓ سے محبت رکھیں ان کی عظمت پہچانیں، اب اگر تمہیں امت میں کوئی جگہ حاصل کرنی ہے تو اسی تیسرے درجہ میں داخل ہو جاؤ، حضرت حسینؓ سے کسی نے حضرت عثمانؓ کے بارے میں سوال کیا (جب کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا) تو انہوں نے سوال کرنے والے سے پوچھا کہ تم مہاجرین میں سے ہو؟ اس نے انکار کیا

پھر پوچھا انصار میں سے ہو؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا۔ تو فرمایا بس اب تیسری آیت وَالَّذِيْنَ جَاءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ کی رہ گئی۔ اگر تم عثمان غنیؓ کی شان میں شک وشبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس درجہ سے بھی نکل جاؤ گے۔

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ کی محبت ہم پر واجب ہے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شخص کسی صحابیؓ کو برا کہے یا اس کے متعلق برائی کا اعتقاد رکھے اس کا مسلمانوں کے مال میں کوئی حصہ نہیں۔ پھر اسی آیت سے استدلال فرمایا اور چونکہ مال فئے میں حصہ ہر مسلمان کا ہے تو جس کا حصہ اس میں نہ رہا اس کا اسلام وایمان ہی مشکوک ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار اور دعا کرنے کا حکم دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کے آپس میں جنگ وجدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے (اس لئے کسی مسلمان کو مشاجرات صحابہ کی وجہ سے ان میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں) حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ امت اس وقت تک ہلاک نہیں ہو گی جب تک اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت وملامت نہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابیؓ کو برا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں زیادہ برا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ یہ ظاہر ہے زیادہ برے صحابہؓ تو ہو نہیں سکتے یہی ہو گا جو ان کی برائی کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو برا کہنا سبب لعنت ہے۔

عوام بن حوشبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس امت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ صحابہ کرامؓ کے فضائل اور محاسن بیان کیا کرو تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہو اور مشاجرات اور اختلافات جو ان کے درمیان پیش آئے ہیں ان کا ذکر نہ کیا کرو جس سے ان کی جرأت بڑھے (اور وہ بے ادب ہو جائیں) (یہ سب روایات تفسیر قرطبی سے لی گئی

ہیں۔ (معارف القرآن صفحہ ۳۸۰،۳۸۶،۸۷)

صحابہ سے محبت کی وجہ

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پاک و مقدس جماعت امت کے عام افراد کی طرح نہیں، بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام امت کے درمیان محکم اور مضبوط واسطہ ہیں۔ ان کی حیثیت حضور کے نمائندوں کی ہے اور اسی لئے عام امت سے جدا ایک خاص امتیازی شان رکھتے ہیں، ان کی تقدیس اور تعدیل پر ہمارے قرآن کریم، سنت نبوی اور دین کے تمام عقائد و احکامات کا دارومدار ہے۔ وہ رسالت کے اولین مبلغ ہیں جن کے ذریعے دین حق پوری امت کو پہنچا۔

قرآن مجید میں رحمۃ للعالمین کے تلامذہ یعنی صحابہ کرام کی پاک سیرت اور بے مثال کردار کی مدح اور ستائش بہت کثرت اور تکرار کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ انھیں رضائے الٰہی اور جنت کی بشارتیں دی گئی ہیں اور امت کو ان کے ادب و احترام اور ان کی اقتداء کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اور ان میں سے کسی کو برا کہنے پر سخت وعید بھی فرمائی ہے۔ ان کی محبت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان سے بغض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض قرار دیا ہے۔

صحابہ کے بارے میں حضور کی تاکید

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

اللّٰہَ اللّٰہَ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم۔ الحدیث (رواہ الترمذی)

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو تنقید و تشنیع کا نشانہ نہ بنا جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے بغض رکھا۔

اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے ان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی

اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں گرفتار کر دے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تسبوا اصحابی فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ۔

میرے اصحاب کو برا مت کہو۔ اگر تم لوگوں میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے تو صحابہ میں سے کسی ایک کے ایک مد کے برابر ثواب کو نہیں پہنچ سکتا ہے نہ آدھے مد کے برابر۔

اور ترمذی کی روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو برا کہتے ہیں تو تم کہو اللہ کی لعنت ہو تمہارے اس شر پر (یعنی تمہاری اس شر کی بات پر)

مقام صحابہ رضی اللہ عنہم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقدس اور عدالت اور ان کے ساتھ محبت، ان کی تعظیم و تکریم یقینی طور پر ثابت ہے

جس شخص کی زندگی مجموعی طور پر اچھی اور پاکیزہ ہو اس پر کسی گناہ کبیرہ کا الزام عقل اور فطرت کی رو سے بھی اس وقت تک درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ مضبوط اور قطعی دلائل سے ثابت نہ ہو۔ اور صحابہ کرامؓ کا مقام تو بہت ہی بلند ہے۔ ان حضرات کا تقدس اور عدالت قرآن و سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ پس تاریخ کی جھوٹی، بے سند اور ضعیف روایات کی یہاں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اسی لئے علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ "جو لوگ صحابہ کرامؓ سے بغض یا ان میں سے بعض کے ساتھ بغض رکھے یا ان کو برا بھلا کہے، ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ایسے لوگوں کا قرآن پر ایمان سے کیا واسطہ جو ان لوگوں کو برا بھلا کہتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے راضی ہونے کا اعلان کیا ہے۔"

صحابہ کرامؓ پر تنقید و اعتراض کرنا در اصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپؐ کی تربیت

پر اعتراض کرنا ہے۔ کیونکہ پھر تو یہ وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تزکیہ صحیح اور کامل نہ تھی، ورنہ جن حضرات نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کی تھیں اور جن کی خوبیوں پر خود قرآن مجید اور حضورؐ شاہد ہیں، ان حضرات میں روحانی بیماریاں، بددیانتی اور خود غرضی کیسے آگئیں۔

الغرض صحابہ کرامؓ کے بارے میں پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ ہستیاں یہی ہیں۔ ان کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اُس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور تمام صحابہ کرامؓ کی تعظیم و تکریم، اُن سے محبت رکھنا، اُن کی مدح کرنا واجب ہے۔ اگر کسی سے بظاہر کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اور اُن کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوئی تھی۔ سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کے الفاظ سے لیا جائے گا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

یہ ایک امت تھی کہ جو گزر گئی ان کے اعمال اُن کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیسا عمل کیا تھا۔

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ صحابہ کرامؓ کی عظیم الشان جماعت کے بارے میں اپنی زبان یا قلم سے کوئی ایسا حرف نہ نکالے جس سے کسی صحابی کی تنقیص یا کسرِ شان ہوتی ہو۔ اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کوئی بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا دروازہ کھولتا ہے وہ دین اسلام کی بنیادوں کو کھودتا ہے اور وہ کبھی اسلام کا خیرخواہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ، حضورؐ، صحابہؓ اور اسلافؒ سے محبت

الغرض اللہ جل شانہٗ کی ذات عالی ہی اشد محبت کی مستحق ہے کیونکہ محبت جن وجوہات کی بناء پر ہوا کرتی ہے وہ بدرجہ اتم ان میں جمع ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس لئے نہایت ضروری ہے کہ آپ کی محبت ہی اللہ تعالیٰ کی

محبت اور اس کی اطاعت کا ذریعہ ہے، آپ ہی اَقْرَبُ النَّاسِ اِلَی اللّٰہ یعنی سب انسانوں سے زیادہ اللہ سے قریب ہیں، اس کے بعد تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور سلفِ صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے ساتھ محبت نہایت ضروری ہے۔

گویا یہ محبت کی ایک زنجیر ہوتی جس کی کڑیاں یعنی سلف صالحین کی محبت، صحابہ کی محبت، نبی کریم کی محبت اور اللہ کی محبت ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں (جس طرح کہ علمی سلسلہ کی زنجیر ہے کہ قرآن وسنت کا علم صحابہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہؓ سے تابعین کو منتقل ہوا اور پھر ان سے ان کے تلامذہ یعنی تبع تابعین کو، قرآن وسنت کے حاملین کا یہ سلسلہ الحمد للہ آج تک جاری ہے۔

سلفِ صالحین سے محبت رکھنا، ان کے نقش قدم پر چلنا ہی ہماری کامیابی وفلاح کا ذریعہ ہے، کیونکہ کسی شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے لئے محبت وتعلق رکھنا، اللہ پاک کی عظمت کا حق ادا کرنا ہے، اور اس کا شمار بھی عبادات میں سے ہے، حدیث شریف میں آتا ہے، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندہ نے بھی اللہ پاک کے لئے کسی دوسرے بندہ سے محبت کی اس نے اپنے رب کی عظمت وتوقیر کی۔ (مسند احمد، مشکوٰۃ)

اللہ پاک سے محبت کے لئے اس کے محبوبین کی محبت ایک ناگزیر واسطے کی حیثیت رکھتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کا ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان سے محبت کا ذریعہ صحابہ کرام ہیں، اسی طرح صحابہ کرامؓ سے محبت کا واسطہ سلف صالحین ہیں۔

مجنوں جو لیلیٰ کے عشق میں مست تھا لیلیٰ کی گلی کے کتے کو محبت کی نظر سے دیکھتا تھا، کتے سے محبت تو ہرگز مقصود نہ تھی لیکن یہ لیلیٰ کے ساتھ محبت ہی کا اثر تھا، جب وہ لیلیٰ کے گھر جاتا تو وہاں کا طواف کرنے لگتا، لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو، تو کہا۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی وَاُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَا	میں گزرتا ہوں ان شہروں پر جو لیلیٰ کے شہر ہیں تو چومتا ہوں اس دیوار کو اور اس دیوار کو

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي ۔۔۔ اوران شہروں کی محبت نے میرے دل
وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَ ۔۔۔ میں گھر نہیں کیا ہے مگراس کی محبت نے

جوان شہروں میں رہ چکی ہے

محبوب لذاتہٖ یعنی اصل محبوب تو صرف ایک ہی ہے لیکن محبوب سے متعلق اشیاء کی محبت، اس کی محبت کی علامت اور دلیل ہوتی ہے اوراس کی محبت بڑھانے میں ممد ومعاون ہوتی ہے، اسی طرح جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ ضرور بالضرور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھے گا اور جو حضور سے محبت کرتا ہے وہ یقیناً صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعین اور سلف صالحین کو علی الترتیب محبوب رکھے گا، گویا سلف صالحین صحابۂ کرام اور انتہا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا عشق اور قرب حاصل کرنے کا ایک واسطہ اوراس کی محبت کی علامت ہے۔

اللہ تک پہنچنے کا دوسرا واسطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے۔ یعنی اللہ جل شانہٗ نے ہمیں اپنا قرب حاصل کرنے کے لئے دو واسطے مقرر فرما دیئے ہیں، جن کے ذریعے ہمیں اللہ کی پسند اور ناپسند، اوامر اور نواہی کا علم ہو جاتا ہے، کتاب جو تمام انسانیت کے لئے قانون اور ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور دوسرے اپنے ایسے چنے ہوئے مقبول بندے جن کو بنی آدم ہی میں سے منتخب فرما کر اپنی پسند اور ناپسند کا عملی نمونہ اور کتاب کی عملی تفسیر بنا کر بھیجا۔

تجربہ گواہ ہے کہ کوئی کتاب کتنی ہی آسان، مفصل اور جامع کیوں نہ ہو انسان کی تعلیم وتربیت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، انسان کی تربیت اور اصلاح کرنے والا انسان ہی ہو سکتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی اصلاح اور تعلیم کے لئے دو چیزوں کا سلسلہ جاری رکھا، ایک کتاب اللہ اور دوسرے رجال اللہ اللہ والے لوگ، جن میں انبیاء علیہم السلام ان کے نائبین، علماء ومشائخ سب داخل ہیں۔

دو شدید غلطیاں | رجال اللہ اللہ والوں کے بارے میں لوگ دو مذموم غلطیوں کا شکار

رہے ہیں یعنی افراط اور تفریط۔ دین میں اکثر فتنے اور فرقے بندیاں انہی دو غلطیوں کا نتیجہ ہیں، کہیں تو رجالُ اللہ کو اتنا بڑھا چڑھا دیا کہ نوبت رجال پرستی (بندوں کی عبادت) تک پہنچ گئی، اور کہیں گھٹا اتنا کر حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ (یعنی) صرف اللہ کی کتاب ہی ہمارے لئے کافی ہے کا اعلان کرنے لگے اور حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کی غلط تفسیر میں نبی کریمؐ صحابہؓ تابعین اور سلفِ صالحین کو بالکل نظر انداز کرنا اپنا طریقہ بنالیا۔

اصل اور صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ رجالُ اللہ سے ان کے شایانِ شان محبت رکھتے جو کہ نہایت ضروری ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضورؐ ایسے شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس کو ایک جماعت سے محبت ہے لیکن وہ ان کے ساتھ نہ ہوسکا؟ آپ نے فرمایا جو شخص جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ ہے یعنی آخرت میں اسی کے ساتھ ہوگا یا کردیا جائے گا۔ سائل کا مقصد بظاہر یہ معلوم کرنا تھا کہ ایک شخص جو اہلِ تقویٰ کے کسی گروہ یا کسی مردِ صالح و متقی سے محبت کرتا ہو لیکن عمل اور سیرت میں ان کے درجہ کا نہ ہو بلکہ نیچے ہو، اس کا انجام کیا ہوگا، تو نبی کریمؐ کے جواب کا حاصل (اسی مناسبت سے) یہ ہوا کہ یہ شخص عمل میں کم ہونے کے باوجود انہیں اللہ کے محبوب لوگوں کے ساتھ کردیا جائے گا جن کے ساتھ اس کو محض اللہ کی خاطر اور دین کے تعلق سے محبت تھی، اسی مفہوم یعنی اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کہ آدمی کا حشر قیامت میں اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو کو بہت سے صحابہ کرامؓ سے مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنی عاقبت کو کامیاب و شاندار بنانے کے لئے اللہ والوں سے محبت کا تعلق قائم کرکے قیامت میں ان کی معیت حاصل کرلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے۔

من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ فقد استکمل الایمان۔	جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ تعالیٰ (ہی) کے لئے کسی سے دشمنی کی اس کا ایمان کامل ہے۔

گمراہ فرقوں کی ابتداء۔ پس دین میں تفریق و اختلاف کا منبع سلفِ صالحینؒ صحابہؓ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے سے کٹ جانا ہے، خواہ اس سلسلے کی کسی ایک کڑی سے ہو۔

مسلمانوں میں اُٹھنے والے تمام فتنے اسلام کا نعرہ لگا کر بلند ہوتے ہیں اور دین ہی کا لبادہ اوڑھ کر نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً خوارج نے سب سے پہلے حکومت الٰہیہ کا نعرہ لگا کر صحابہؓ سے جدائی اختیار کی، عقیدے کی گمراہی میں خود بھی مبتلا ہوئے اور عالم اسلام میں بھی خطرناک فتنہ برپا کیا۔ اسی طرح ماضی قریب میں ترقی اسلام اور ترقی المسلمین کے نام سے یورپی علوم اور تہذیب کی ترویج و ترقی کے لئے جو تحریکیں چلیں ان کے نتیجہ میں دینی تربیت سے عاری ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خوارق اور معجزات کا انکار کرنے لگے۔ اسی طرح مسلمانوں کو مختلف گمراہ تحریکوں میں بہلا اور پھسلا کر اُلجھا دیا اور ان کو علماء سے متنفر کرنے اور اسلاف سے کاٹ دینے کا فساد شروع کیا۔

اس قسم کی سب گمراہ کن تحریکوں کی آواز تو اسلام ہی تھی لیکن روح اور مقصد اسلام سے عاری تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ناسمجھ اور ناعاقبت اندیش لوگ دلفریب نعروں اور ظاہری چمک دمک سے دھوکا کھا کر راہ راست سے دور ہو گئے اور سمجھ دار لوگ حقیقت پہچان کر ایک طرف محفوظ رہے۔ دونوں طرف سے افراد کٹ کٹ کر ایک دوسرے کے مدِ مقابل جمع ہونے لگے اور یوں اُمتِ مسلمہ مرحومہ تفرقہ بازی اور فتنہ و فساد کا شکار ہو گئی۔

وہ حضرات جن کے سامنے گمراہ افراد اور فرقوں کی تاریخ موجود ہے خوب جانتے ہیں کہ سلفِ صالحین سے رابطہ کٹ جانے اور اعتماد اُٹھ جانے کے بعد دین کو سمجھنے اور دین کی تشریح کرنے کے لئے کوئی حدود و حصار یا اصول و قواعد باقی نہیں رہتے۔ قرآن و سنت کی ایسی بے سروپا اور لغو تفسیریں اور مضحکہ خیز تاویلیں سامنے آتی ہیں جو دین کی دھجیاں اُڑانے کے مترادف ہوتی ہیں۔ یہی گمراہی کی بنیاد ہوتی ہے۔ پھر کہیں صحابہؓ پر جھوٹے الزامات لگا کر اور کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا انکار کر کے اپنی طرف

سے دین کی تفصیلات گھڑ لی جاتی ہیں اور نئے گمراہ فرقوں کی ابتداء ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کے بعض نام نہاد مفکرین اور مضمون نگار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کے ساتھ لگے ہوئے سلف صالحین (جو کہ انقلاب آفرین صلاحیتوں اور کارناموں کے عظیم الشان نمونے قائم کر چکے ہیں) پر ایک طویل المیعاد فکری قحط اور ذہنی و عملی تعطل کا الزام عائد کرتے ہیں۔ اور اپنے زہریلے خیالات کو انقلابِ اسلام اور ترقی دین کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ گویا جو دین چودہ سو سال تک قائم و دائم، جاری و ساری رہا، اس کو اسلاف میں سے کوئی ٹھیک طرح سے سمجھا ہی نہ تھا۔ اب آ کر یہ حضرات ہمیں صحیح دین سمجھا رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ لوگ صرف اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کرنے والے ہیں۔

ان حضرات کا طریقۂ کار یہ ہے کہ پہلے سے ہی ایک رائے قائم کر لیتے ہیں پھر اس کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم کی آیات اور احادیثِ نبوی کے عجیب و غریب مطالب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حضرات ایسی آیات اور احادیث بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے ان کی بے بنیاد رائے کی صریح نفی ہوتی ہے۔ تو یہ لوگ قرآن مجید کی اس آیت کے مصداق بن کر خود پرستی اور شرک کے مرتکب ہوتے ہیں کہ:-

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ .... الآیہ۔ کیا آپ نے اس شخص کو ملاحظہ فرمایا ہے جس نے اپنی خواہش نفسانی کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

پس یہ لوگ اپنی خواہشات کو معبود بنا لیتے ہیں اور ان کا نفس ہی ان کے سلئے قرآن بھی ہوتا ہے اور حدیث بھی۔ اور جو شخص حلال و حرام، جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے نفس کی پیروی میں اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دے، وہ گویا اپنے نفس کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ ائمہ اربعہ اور تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اتباع ہوئی احکامِ دین میں قطعاً حرام ہے۔ پس جو شخص اپنی نفسانی اغراض کو سامنے رکھ کر قرآن و حدیث میں اس کے لئے دلائل تلاش کرتا ہے وہ یقیناً متبع ہویٰ ہے۔ اگر اسے اتفاقاً کوئی سند مل بھی جائے لیکن بہرحال معاملہ تو علیم و خبیر اللہ کے سامنے ہی ہے جو دلوں کے قصد اور نیتوں سے بھی طرح واقف ہے

اسلاف کی فضیلت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ارشاد ہے کہ:

خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ، ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔
رواہ الاربعۃ

میری امت کا بہترین دور میرا ہے پھر اس کے بعد وہ لوگ جو ان سے ملتے ہیں پھر اس کے بعد ان لوگوں کا ہے جو ان سے ملتے ہیں۔

یعنی تین دور، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ، صحابہؓ کا دور اور پھر تابعین اور تبع تابعین کا دور بہترین ہیں، اب اگر یہ نام نہاد فلسفی اور انشاء پرداز یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضورؐ کے صحابہؓ اور سلف صالحین دین کو ٹھیک طرح نہیں سمجھے تھے تو پھر ان کی تمام فکری اور عملی کاوشیں مشکوک ہو جاتی ہیں اور دین کا سارا علمی ورثہ بے فائدہ اور بے معنی نظر آنے لگتا ہے، سلف پر الزامات ایسی عیاری سے پیش کئے جاتے ہیں کہ بظاہر کچھ اہم اور سنگین نظر نہیں آتے۔ لیکن اس کے اثرات دل و دماغ اور طرز فکر و عمل پر بہت گہرے اور دور رس ہو سکتے ہیں، آدمی یوں سوچنے لگتا ہے کہ اگر ہمارے اسلاف نے ماضی میں کچھ نہیں کیا تو مستقبل کے بارے میں ان سے کس فائدے کی توقع کی جا سکتی ہے، ان کے کارنامے بے قیمت اور ہم تک پہنچایا ہوا دین مشتبہ ہو جاتا، دین کی اصل تعلیمات شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہتیں، ان نام نہاد مفکرین کی نحوست سے مغز و پوست، ظاہر و باطن کے فلسفے وجود میں آتے ہیں اور صاف و سادہ، عملی دین ایک ناقابل فہم معمہ اور گورکھ دھندا بن جاتا ہے اور دشمنان دین اور گمراہ لوگ اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور تفرقہ بازی کے لئے فضا سازگار ہو جاتی ہے۔

لیکن رحمۃ للعالمین اور ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتنوں کے بارے میں پہلے ہی سے بتا دیا ہے کہ علامات قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ اس امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو برا کہنے لگیں (جامع ترمذی) اور ابن ماجہ نے بروایت محمد بن المنکدرؒ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اس امت کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت کریں اس وقت، جس کسی نے کوئی حدیث چھپائی اور اگلوں

کی فضیلت ظاہر کی، تو اس نے گویا اس پوری شریعت کو چھپایا جس کو اللہ جل شانہ نے اتارا ہے۔

گزشتہ صفحات میں محبت رسول اور محبت اسلاف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مقصد یہ نہیں کہ کسی کی محبت کے نام پر ایسے افعال و اعمال اختیار کئے جائیں جن میں شرک یا شرک کا شائبہ ہو۔ یا حب رسول کے نام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی صفت الٰہی، علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ جل شانہ کے برابر کر دیں۔ یا اسی طرح دوسری مشرکانہ حرکتیں اختیار کریں، حالانکہ ان ساری چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود منع فرمایا ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ۔

مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا کہ اللہ کا بیٹا اور جز قرار دیا، میں صرف اللہ کا بندہ ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

یعنی اس سے منع کیا گیا ہے آپ کو اللہ کا جز و مانیں یا آپ کی صفات میں اتنا مبالغہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے برابر سمجھنے لگیں۔ البتہ آپ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جیسا کہ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا، میں پہلا شخص ہوں گا، جس کی قبر پھٹے گی اور پہلا شخص ہوں گا جس کی شفاعت قبول ہوگی۔

اسی طرح حب رسول کی آڑ میں بری بدعات کو اختیار کرنا بھی عشق کے جھوٹے دعوی کی دلیل ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ہو اور اس کی زندگی احکام الٰہی سے بغاوت اور معصیت کا نمونہ ہو۔ شریعت

کے احکام کی خلاف ورزی کے باوجود اگر ہم خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا سمجھیں تو ہم زبردست خود فریبی اور شیطانی دھوکے میں مبتلا ہیں حضرت رابعہ بصریؒ نے ایسے ہی مدعیانِ محبت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

تعصی الالٰہ و انت تزعم حبہ	اے محبت کے جھوٹے مدعی تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی
ھذا لعمری فی الفعال بدیع	کرتا ہے اور اس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، عقل
لو کان حبک صادقا لاطعتہ	اور قیاس کے لحاظ سے یہ بات بہت ہی عجیب ہے
ان المحب لمن یحب یطیع۔	اگر تو دعویٰ محبت میں سچا ہوتا تو اس کی فرمانبرداری

کرتا کیونکہ ہر محب اپنے محبوب کی بات کو دل و جان سے قبول کرتا ہے۔

محبت کی علامات میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کا اتباع کیا جائے۔ آپ کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کی جائے اور جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان سے بچا جائے اور ہر حالت میں خواہ خوشی ہو یا غم آپ کے طریقوں کی پیروی کریں، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت
فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔	رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت
(آل عمران آیت ۳۱)	کرنے لگیں گے۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں اس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ امت مسلمہ کہیں شرک میں مبتلا نہ ہو جائے اور نصاریٰ وغیرہ کی طرح کسی کو درجہ الوہیت تک پہنچا کر اپنی دنیا و آخرت کو تباہ و برباد نہ کر ڈالے اور اسی لئے ایسے حرام اور ناجائز اسباب ختم کرنا بھی بہت ضروری ہے، جس سے شرک کے لئے راہیں کھلتی ہیں۔

لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے صحابہؓ اور تابعین و تبع تابعین اور صلحائے امت سے محبت پر ایمان کا دارومدار ہے۔ اس لئے آپ اور آپ کے تابعین سلفِ صالحین کے ساتھ سچی محبت، ان کے ادب و احترام کو شرک کہنا، یا ان حضراتؒ کے اتباع میں جائز اور مباح افعال کو شرک سمجھنا یا غیر اللہ کی

عبادت شمار کرنا، امت مسلمہ پر بہت بڑا ظلم ہے۔

محبت بڑھانے کے جائز اسباب سے منع کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تابعین الی یومنا ہذا کی محبت اور عظمت کے جذبہ کو کمزور اور ختم کرنا ہے اور امت مسلمہ میں انتشار و نفاق پیدا کر کے امت کو پارہ پارہ کرنا ہے۔

عصر حاضر کے نام نہاد توحید کے علمبرداروں کی توحید کو اگر دیکھا جائے تو ان کی توحید اسی میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے کہ دست بوسی، توسل، سماع موتی وغیرہ کا شد و مد سے انکار کیا جائے۔ اور ان مسائل کے قائل حضرات کو بدعتی یا مشرک قرار دیا جائے حالانکہ یہ اختلافی مسائل ایسے نہیں جن کے اقرار یا انکار پر کفر و ایمان کا دار و مدار ہو بلکہ دونوں طرف دلائل موجود ہیں جن میں سے بعض کا مفصل بیان پہلے گزر چکا۔ اس پر طرہ یہ کہ اسلاف کے آثار اور ان کی محبت کے جذبات کے مٹانے کو بزعم خویش توحید کا بول بالا کرنا سمجھتے ہیں اور شرک کے ذرائع اور اسباب کو ختم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور دوسری طرف یہی نام نہاد موحدین، کفار و مشرکین جیسے روس و امریکہ کے آگے جھکنا، شاہوں کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بھول جانا عصبیت اور قوم پرستی میں آکر دوسرے مسلمانوں کی تکفیر کرنا، الغرض یہ موحد نفس پرستی، دولت پرستی، شاہ پرستی، قوم پرستی اور مادی قوت کے سامنے سرافگندگی میں مشرکین اقوام سے بازی لے گئے ہیں۔

دوسری طرف سچی محبت کو بدنام کرنے والے محبت کے داعی ہیں جن کے ہاں محبت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ دست بوسی، قیام، توسل اور سماع موتی وغیرہ کا اقرار کرنا ہے اور جو یہ نہ مانے وہ گمراہ، کافر اور گستاخ ہے۔ اس پر ظلم یہ کہ محبت و تعظیم کے پردے میں قبر پرستی، پیر پرستی اور ہر قسم کی بدعات اور خرافات کے رواج دینے کو اپنے خیال میں محبت بڑھانے کے اسباب سمجھتے ہیں، زبانی محبت کے یہ دعویدار، دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، ان کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری سے ایسے جی چراتے ہیں کہ منافقین و کفار کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔

ہر درد مند دل کو رونا میرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

آخر میں محبت کی اہمیت پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا حکیمانہ مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

"جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے وہاں اس پہلو پر اور زیادہ زور دینے اور اس کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات گرامی کے ساتھ صرف ضابطے اور قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی اور جذباتی تعلق اور ایسی گہری اور دائمی محبت مطلوب ہے جو جان و مال، اہل و عیال کی محبت پر فوقیت لے جائے۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں ان تمام مخالف اسباب، محرکات سے محفوظ اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے جو اس محبت کے ستونوں کو خشک یا اس کو کمزور کرتے ہیں، جذبات، احساسات محبت میں افسردگی، سنت پر عمل کرنے کے جذبہ میں کمزوری، اور آپ کو دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل سمجھنے میں تردد اور سیرت، حدیث کے مطالعے سے روگردانی اور بے توجہی کا سبب بنتے ہیں، سورۂ احزاب، سورۂ حجرات، سورۂ فتح وغیرہ قرآنی سورتوں کے غائر مطالعہ اور تشہد و نماز جنازہ میں درود و صلوٰۃ کی شمولیت پر غور و فکر، قرآن میں درود کی ترغیب اور درود کی فضیلت میں بکثرت وارد ہونے والی احادیث کا راز سمجھنے کا یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مسلمان سے اس سے کچھ زیادہ مطلوب ہے جس کو صرف قانونی اور ضابطہ کا تعلق کہا جاتا ہے جو محض ظاہری اطاعت سے پورا ہو جاتا ہے، بلکہ وہ پاس ادب محبت اور تشکر و امتنان کا جذبہ بھی مطلوب ہے جس کے سرچشمے دل کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہوں، جو رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہو، اس محبت احترام اور احترام آمیز محبت کو قرآن نے تعزیر و توقیر کے لفظ سے ادا کیا ہے۔"

صحابہؓ کے چند واقعات کی طرف رہنمائی کر کے آگے فرماتے ہیں:۔

"اس عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان علمائے راسخین، مصلحین، مجددین، زعما قائدین کو وافر ملا۔ جنھوں نے دین کی حقیقی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور جن کے مقدر میں دین وملت کے احیاء و تجدید کا اہم کارنامہ انجام دینا تھا۔ اس پاک محبت کے بغیر جو شرعی احکام و آداب کے تابع و اسوۂ صحابہؓ کے اتباع و تقلید کے ساتھ ہو، اسوۂ رسول کی کامل پیروی و اتباع، جادۂ شریعت پر استواری، نفس کا دوامی محاسبہ اور عسر و یسر اور طبیعت کی آمادگی و گرانی (منشط و مکرہ) میں خدا اور رسول کی فرمانبرداری ممکن نہیں۔ یہی اکسیر النوع، نفسیاتی امراض کا علاج، تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کا موثر ذریعہ ہے۔ محبت کی ایک لہر خس و خاشاک کو بہالے جاتی ہے اور رگ و ریشہ، جسم و جان میں اس طرح دوڑ جاتی اور جذب ہو جاتی ہے۔

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

مسلمان جو کبھی خدا اور رسولؐ کے عشق کی بدولت شعلۂ جوالہ تھے اس کے بغیر چوب خشک اور سرد خاکستر بنے ہوتے ہیں۔" (البلاغ صفر المظفر ۱۴۰۵ھ)

❁

باب ہشتم
توحید

باب ہشتم

توحید

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

فطرتی عقیدہ

اللہ رب العزت کی توحید انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور توحید کا قائل ہوتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مالک و متصرف نہیں۔ اس لئے تقاضائے فطرت اور جبلت سے مجبور ہو کر بے شمار بتوں اور دیوتاؤں کو معبود و مسجود ماننے والے بھی سخت مشکلات اور مصائب میں اپنے آپ کو بے سہارا پا کر دل کی گہرائیوں سے صرف ایک خدا ہی کو پکارتے ہیں لیکن تکالیف اور حوادث سے نجات پا کر پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں مشرکین بھی کسی نہ کسی نوعیت سے توحید کی شان و عظمت کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اعتقادی اور عملی طور پر متعدد خداؤں کو ماننے کے باوجود فطرتی طور پر خالق کائنات اور بڑے خدا کو ایک ہی مانتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ چھوٹے خدا اس کے قائم مقام ہیں یا اس کی صفات کے نمائندے ہیں۔ یا دنیا کے کاروبار کو اوروں میں تقسیم کر کے بڑا خدا آرام کرتا ہے یا پھر چھوٹے خداؤں کو بڑے خدا کے اجزا قرار دیتے تھے۔ اس لئے وہ عبادات میں اللہ تعالیٰ و تبارک کے ساتھ مخلوق کو بھی شریک کرتے تھے جس کی وجہ سے توحیدِ خالص سے محروم ہو کر دنیا اور آخرت کی تباہی و بربادی کما گئے۔

دین اسلام نے توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی العبادات، الغرض توحید کو ایسے مکمل، واضح اور صاف ترین انداز میں پیش کیا ہے کہ عقول انسانی کو ہر قسم کی خرافات اور اوہام کے زنگ سے محفوظ اور پاک رکھتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ شانہٗ کو کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم ہے اسی طرح اس پر قدرت

بھی ہے اور کائنات کی کوئی چیز چھوٹی ہو یا بڑی، نہ اس کے علم سے باہر ہے اور نہ اس کے حکم، قضا، و قدر سے آزاد۔ اللہ جل شانہ کا علم، اس کا ارادہ، اس کی مشیت اس کی قدرت اور اس کی تکوین آسمان و زمین کی ایک ایک چیز پر حاوی اور کائنات کے ایک ایک ذرہ کو محیط ہے۔ ساری کائنات اس کے قید و بند میں ہیں اگر کہیں کبھی ایک پتہ بھی ہل جاتا ہے تو وہ اس کے علم و ارادہ اور حکم کے بغیر نہ گر سکتا ہے اور نہ ہل سکتا ہے۔ وہ کائنات کے چلانے میں کسی کی معاونت کا محتاج نہیں اور نہ اس کے نظام و تدبیر میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ نہ اس نے کائنات میں تصرف کا اختیار کسی کو دیا ہے اور نہ وہ کسی کو خدائی اختیارات دیتے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ مخلوق چاہے زمینی ہو یا آسمانی، جامد ہو یا مائع۔ الغرض جیسی بھی ہو کسی کو بھی متصرف، عزت، ذلت دینے والا، مارنے اور جلانے والا، صحت و قوت دینے والا نہ تسلیم کریں۔ اور تمام صفات کمال سے صرف خدائے واحد و لاشریک ہی متصف ہے اس کی حکمرانی نہ صرف کائنات کے ذرے ذرے پر ہے بلکہ تمام مخلوقات اور انسانوں کے دلوں، ان کے جذبات و احساسات، روح و شعور اور لطیف ترین عناصر سب اس کے کامل و مکمل قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان نسبتوں کا قطعی انکار کریں جو توحید خالص کے منافی ہوں، نہ اللہ تعالیٰ کو کسی سے زوجیت کا رشتہ ہے نہ جزئیت نہ ولدیت اور نہ ہی اخوت کا تعلق ہے۔ غرض جس طرح دین اسلام نے توحید کے مسئلہ کو ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک و صاف کر کے اللہ تعالیٰ کو تجسیم سے وراء الوراء بتلا کر توحید کامل کی طرف دعوت دی ہے۔ اسی طرح اس نے توحید کے فلسفیانہ عقیدے کو جو اس بحث میں حد سے بڑھ کر صفاتِ الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رؤیت کے، سمیع ہے بغیر سمع وغیرہ وغیرہ، کو بھی باطل ثابت کیا ہے۔ فلسفیانہ عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس کے لئے تعطل لازم و ضروری بن جاتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ سمیع اور بصیر ہے۔ سنتا ہے دیکھتا ہے۔ بلاشبہ وہ قدرت کاملہ کے

ساتھ قادر ہے اور صفاتِ رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفات جیسے سمع و بصر کے ساتھ مخلوق کے دیکھنے اور سننے کا دُور کا تعلق یا مشابہت بھی نہیں جس طرح وہ اپنی ذات میں ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔ — نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی اور وہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی۔

مومن کا حال

مومن کی نگاہ ہر حال میں ذاتِ باری تعالیٰ پر ہوتی ہے تکلیف ہو یا راحت، اسی پر توکل کرتا ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اور اللہ جل شانہ مسبب الاسباب ہیں۔ انہوں نے ساری اشیاء میں اسباب و اثرات خود رکھ دیئے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان اسباب پر تکیہ و اعتماد کر کے مؤثر حقیقی سے نگاہ ہرگز نہ ہٹائیں کیونکہ ہر قسم کے حوادث اور مصائب میں کام بنانے والا ذاتِ اللہ رب العزت ہے۔ پس ہر دکھ درد اور تکلیف میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے حدیث شریف میں آتا ہے۔

لیسئل احدکم ربہ حاجتہ حتی شسع نعلہ اذا انقطع فانہ لم یتیسر لم یتیسر۔ — چاہیئے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی حاجت خدا ہی سے مانگے یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی، جب وہ ٹوٹ جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر آسانی نہ فرماویں تو جوتے کا تسمہ میسر نہیں آسکتا۔

اسی پر بس نہیں، دین اسلام میں معاملات میں بھی بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی اعمال و اقوال کا مقصد حکم الٰہی کی بجا آوری ہے اگر ایک باپ اپنے بیٹے پر خرچ کرتا ہے یا ایک بیٹا اپنے باپ کی تعظیم و تکریم کرتا ہے تو نیت یہ ہونی چاہیئے کہ اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے یہ کام کیا جا رہا ہے۔ اور یہی نسبت سب دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلق یا محبت اور تعظیم اور زندگی کے دوسرے معاملات میں جاری و ساری رکھنی چاہیئے۔ اگرچہ ایسے اعمال سے اپنے نفس کو بھی کچھ حصہ ضرور ملے گا لیکن ذاتی حظِ نفس کا حصول ہرگز مراد و مقصود نہیں ہونا چاہیئے۔

بلاشبہ ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں انبیاء علیہم السلام اصحاب رسول اور صلحاء امت سے محبت کیا کریں اور اللہ تعالیٰ کے سب شعائر کی تعظیم و تکریم کریں اور ان کی ادنیٰ گستاخی اور بے ادبی سے بچیں، لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ کسی بھی مخلوق کی بندگی نہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ و تبارک کی صفات میں کسی کو شریک کریں، اور نہ کسی بزرگ، عالم یہاں تک کہ پیغمبر کے ساتھ وہ رویہ اور معاملہ اختیار نہ کریں جو صرف اور صرف اللہ رب العزت کا حق ہے اور اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

صحابہ کی توحید اور جذبہ جہاد

یہی توحید دین اسلام کی اصل اور اساس ہے جس پر ہمارے دونوں جہانوں کی فلاح و نجات کا دارومدار ہے، یہی ہماری آخرت کی کامیابی کی ضامن ہے، اس کے بغیر انسان عذاب جہنم سے نہیں بچ سکتا، اور نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مستحق ہو سکتا ہے، یہی وہ ایمان تھا جس نے صحابہؓ کے قلوب کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور عظمت سے معمور کر رکھا تھا۔ مخلوق کا کمال و جمال دنیا کی ظاہری چمک دمک اور شان و شوکت ان کی نظروں میں ہیچ تھی، بادشاہوں کا جاہ و حشم اور ان کے درباروں کی زیب و زینت ان کی نگاہوں میں مٹی کے بے جان مجسموں اور ان کے رنگ و روغن سے زیادہ نہ تھے ایک صحابی کفار کے ساٹھ ہزار لشکر کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار ہوتا تھا اسے معلوم تھا کہ کفار کے دل محبت اور یاد الٰہی سے خالی ہیں اور یہ یقین تھا کہ جس دل میں ذکر الٰہی نہ ہو وہ تو مردہ ہے۔ ان کی اولاد کفار کے مقابلے میں خون میں لت پت تڑپتے ہوئے شہید ہوتے تو وہ خوش ہوتے اور اس پر فخر کرتے۔ اور جب کفار کے ساتھ لڑنے میں اُن کی روح نکلتی تو چیخ مار کر پکارتے کہ ہم کامیاب ہو گئے۔

صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ کے لئے آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم اور محبت کرنے والے، اپنے دوسرے بھائیوں کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے والے، ایک بھائی کی تکلیف پر سب بے آرام ہونے والے تھے، اس کے برعکس اللہ ہی کے لئے اس کے

دشمنوں کفار و مشرکین سے شدید بُغض اور نفرت رکھنے والے تھے۔ ان کی تمام تر نفرت دشمنانِ دین اور اغیار کے خلاف استعمال ہوتی تھی جب کہ خود آپس میں شیر و شکر تھے۔ اللہ تعالیٰ و تبارک کی حاکمیت اعلیٰ اور اقتدارِ مطلق کے تقاضے اور مطالبے نہ صرف سچے دل اور سچی زبان سے قبول کرنے والے تھے بلکہ عملی زندگی سے انہیں ثابت کرنے والے اور یقین کامل و صادق کا نمونہ پیش کرنے والے تھے۔

توحید کے ثمرات

بلاشبہ اگر کوئی توحید اسلام کو سچے دل سے اپنائے اور اپنی تمام اغراض، نفع و نقصان کا مرکز صرف ایک ذات رب العالمین کو قرار دے اور عملاً بھی اپنے آپ کو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے سپرد کر دے اور اللہ و رسولؐ کے احکام کے سوا کسی اور کے احکام پر اپنی زندگی کا دارومدار نہ رکھے تو اس کے دل پر اخبات و خشوع، استقلال، توکل اور اخلاص کی وہ انتہائی قوت آجائے گی اور وہ ہر مخلوق سے بے نیاز ایک نڈر مجاہد بن جائے گا۔ اور وہ کسی دجال و مکار اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے سامنے ذلیل ہونے سے محفوظ رہے گا۔ اور دنیاوی مصائب و تکالیف سے اس پر گھبراہٹ اور بے چینی طاری نہیں ہو گی بلکہ اس سے وہ دل میں ایک سرور محسوس کرے گا کیونکہ جس شخص کو اس بات پر یقین ہو کہ اس کا خالق و مالک ایک قادر مطلق ذات ہے جو انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور جس قسم کی خیر و رحمت بھی اس کو پہنچتی ہے محض اللہ جل شانہٗ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں، اور وہی اسے ہر قسم کے ضرر سے بچانے والا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو غیر اللہ چاہے کوئی بھی ہو اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور مخلوق کیسے ہی کیوں نہ ہو اسے کوئی چین اور سکون نہیں دے سکتا ہے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اسے راحت و اطمینان دے سکتی ہے۔ اور یہ عقیدہ اس کے دل و دماغ پر چھا کر اس کا حال بن جاتے تو وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اسی کا محتاج رہے گا، در در کی بھیک مانگنے اور مخلوق کی عملی و فکری ہر قسم کی پرستش

سے بچ جائے گا۔ دنیا ہی میں اسے جنت کا مزہ ملے گا۔ اور وہ ساری دنیا سے بے نیاز خوف و خطر سے بالاتر زندگی گزارے گا۔ اس کا دل دنیا کی کسی قوت سے نہیں گھبرائے گا۔ یہی عقیدہ اس کو وطنیت، رنگ و نسل کی برتری، جسمانی طاقت اور دولت کے غرور، خود غرضی، نفس پرستی، تن پروری، حسد و بغض اور دیگر رذائل، خرافات و اوہام سے بالکل پاک و صاف کردے گا۔ دنیاوی مال و متاع سے اگرچہ اس کا گھر خالی ہوگا، لیکن اس کی آنکھوں سے اطمینان و استغنا۔ کا نور جھلکتا ہوگا۔ اور پیشانی میں قناعت اور سکون کی چمک ہوگی۔ یہ خدا کا ہوگا اور خدا اس کا ہوگا۔

افسوس کہ آج اغیار تو رہنے دیں، اپنے بھی اس توحید مطلوب سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں، ایک طرف تو بعض اہل توحید ہوتے ہوتے ادب واحترام کی حدود سے تجاوز کرکے مخلوق کی عبادت اور ان کو سجدہ، رکوع کرنے لگے ہیں۔ دوسری طرف توحید کے دعوے دار اسلاف کی عظمت و شان گھٹانے اور ان کی بے ادبی اور گستاخی اور ان پر سے اعتماد ختم کرنے ہی کو توحید سمجھ کر امت میں نفاق اور افتراق کے تخم بو رہے ہیں۔

کاش ہر دو فریق افراط و تفریط سے ہٹ کر صحابہ کرامؓ اور اپنے اسلاف کی طرح ایک اللہ پر ہر حال میں دل کی نگاہ جمائے قولی محبت اور قولی توحید[1] کی بجائے محبت میں رنگی ہوئی عملی توحید کو اپناتے تو پھر دیکھئے کہ وہ کون سی طاقت ہے جو کسی ایک مسلمان کو بھی ترچھی نگاہ سے دیکھے۔

ہمیں جاننا چاہیئے کہ ہمارے اسلاف کی عظیم فتوحات اور کامیابیاں صرف توحید اور دین اسلام کو پوری طرح اپنانے میں مضمر تھیں، وہ ہماری طرح صرف محبت یا توحید کے نام پر شیریں اور دلچسپ تقریروں پر اکتفا کرنے والے نہیں تھے، اللہ نہ کرے

---

[1] قولی توحید اور قولی محبت سے غرض یہاں توحید اور محبت کا صرف زبانی جمع خرچ مراد ہے جو کہ صرف بلند دعووں کی حد سے متجاوز نہ ہو۔

کر ہم کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی لفتح القول وتحبس العمل (ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں تقریریں اور باتیں تو کھل جائیں گی اور عمل بند ہو جائے گا) کے مصداق بن جائیں ۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

شعبان ۱۴۰۶ھ
۲۳ اپریل ۱۹۸۶ء
بدھ بوقت گیارہ بجے

مختار الدین
کربوغہ شریف